

# نیچ ڈائری

نیچ کی جنگ کے سبق آموز پہلو



مولانا وحید الدین خاں

# خلیج ڈائری

خلیج کی جنگ کے سبق آموز پہلو

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

## پیش لفظ

میرا معمول ڈائری لکھنے کا ہے۔ پہلے میں کبھی کبھی متفرق طور پر کچھ یادداشتیں لکھ لیتا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۸۳ء سے یہ میرا مستقل معمول بن گیا ہے۔ اب میں ہر روز ڈائری کا ایک صفحہ لکھتا ہوں۔ اس طرح میری ڈائریوں کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ ان کو دو دو سال کے مجموعہ کی صورت میں مختلف جلدوں میں شائع کیا جائے گا۔

خلیج کا بحران (۱۹۹۰ء) شروع ہوا تو قدرتی طور پر میری ڈائری میں اس سے متعلق تاثرات درج ہونے لگے۔ میں روزانہ انگریزی، عربی اور اردو اخبارات اور رسالے بڑی تعداد میں پڑھتا۔ پھر اپنے مزاج کے مطابق، ہر روز کوئی ایک سبق کی بات لے کر اس کو ڈائری کے طور پر لکھ لیتا۔ اس طرح اُس کی بابت ایک پورا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس ذخیرہ کو ”خلیج ڈائری“ کے نام سے الرسالہ مئی ۱۹۹۱ء میں شائع کیا جا چکا ہے۔

یہی مجموعہ اب کتاب کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کی صورت میں چھاپتے ہوئے اس میں دو اضافے کر دئے گئے ہیں۔ یہ اضافے ڈائری کے مضامین کا خلاصہ بھی ہیں، اور ان کی روشنی میں مستقبل کے تعمیری کام کا نقشہ بھی۔

”خلیج ڈائری“ معروف معنوں میں خلیج کی جنگ کا کوئی روزنامہ نہیں ہے۔ وہ صرف سبق آموز تاثرات کا مجموعہ ہے۔ اس میں متفرق طور پر جنگ کے بعض پہلوؤں کو لے کر اس سے سبق اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے اندراجات میں تاریخ کی ترتیب صرف راقم کے تاثرات کی تاریخ کو بتاتی ہے نہ کہ خود جنگی واقعات کی تاریخی ترتیب کو۔

سبق اخذ کرنے کے لئے اس میں دو طریقے استعمال کئے گئے ہیں۔ کہیں براہ راست طریقہ، یعنی جنگ کے واقعہ سے خود جنگ کا سبق لینا۔ مثلاً فروری کا مضمون۔ اور کہیں بالواسطہ طریقہ، یعنی جنگ کے واقعہ سے غیر جنگی سبق اخذ کرنا۔ مثلاً ۱۵ جنوری کا مضمون۔ یہ دونوں ہی طریقے عالمی ادب میں رائج اور مسلم ہیں۔



۱۵ جنوری ۱۹۹۱

۱۵ جنوری ۱۹۹۱ کے اخبارات میں خبر لائے کہ آج رات کو گیارہ بج کر اسٹھ منٹ (11.59) پر وہ ڈیڈ لائن ختم ہو جائے گی جو کویت سے عراقی فوج ہٹانے کے لیے اقوام متحدہ نے مقرر کی تھی۔ اس کے بعد فوراً امریکہ کو یہ حق ہو جائے گا کہ وہ عراق پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دے۔ ٹائمز آف انڈیا (۱۵ جنوری) کے ایڈیٹوریل کی سرخی تھی ————— اٹا شمار صفر پر پہنچنے والا ہے :

Countdown to zero

امریکی نیوز ایجنسی اے پی کے نمائندہ نے سعودی عرب میں اس مقام کا دورہ کیا جہاں امریکہ نے فوجی اڈہ بنایا ہے۔ یہاں انتظام کیا گیا ہے کہ جنگ شروع ہونے کی حالت میں عراق کے اوپر رات دن مسلسل بمباری کی جائے تاکہ یہ تو صد صد ام حسین ہتھیار ڈال دیں یا عراق کو اسٹون اسٹون میں پہنچا دیا جائے۔ اے پی کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے امریکی میجر کوگلان (J.J. Coghlan) نے کہا کہ یہاں ہر آدمی اپنی گھڑی کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے تاکہ یہ معلوم کرے کہ ۱۵ تاریخ کو کون سا دن ہے۔ ہر ایک اپنے آپ کو ارجنٹ صورت حال میں محسوس کر رہا ہے :

Everybody looks at the watch all the time to see which day the 15th is.  
There's a sense of urgency.

جس طرح اقوام متحدہ کے رزلوشن ۶۷۸ (۲۹ نومبر ۱۹۹۰) کے مطابق، امریکہ نے عراق کو الٹی میٹم دیا کہ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک کویت سے اپنی فوجیں ہٹالے، ورنہ اس کے اوپر حملہ کر کے اس کو برباد کر دیا جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کی ایک عمر مقرر کر دی ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ اس متعین وقت تک لوگ اپنی اصلاح کر لیں۔ اس کے بعد دنیا کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اور ہر ایک کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ خدا کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے عمل کا حساب دے۔

اگر لوگوں کو اس خدائی اعلان کا شعور ہو تو ہر آدمی ارطبی کے احساس (sense of urgency) میں زندگی گزارنے لگے۔ ہر آدمی اپنا محاسبہ کرنے میں لگ جائے۔ ہر آدمی اپنے قول و عمل کا نگران بن جائے۔ ہر آدمی اپنا دن اس طرح گزارے گویا کہ وہ شام تک نہیں رہے گا۔ اور شام اس طرح گزرے گویا اگلی صبح اس کے لیے آنے والی نہیں۔ لوگ قیامت کے آنے سے پہلے اپنے آپ کو قیامت میں کھڑا ہوا محسوس کرنے لگیں۔



۱۶ جنوری ۱۹۹۱

آج کل سب سے بڑا موضوع خلیج کا بحران ہے۔ ہر شخص عراق اور کویت کے مسئلہ پر بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عراق ایک بڑا ملک ہے اور کویت اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ملک۔ عراق کا رقبہ ۸، ۱۶۸۸ مربع میل ہے۔ جب کہ کویت کا رقبہ صرف ۶۸۸۰ مربع میل۔ عراق نے اپنی تیل کی دولت کے بڑے حصہ کو فوجی مددوں میں خرچ کر کے ۱۰ لاکھ کی طاقت در فوج بنائی ہے، دوسری طرف کویت کے پاس عملاً کوئی فوج نہیں۔ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر عراق کے حکمران صدام حسین نے اپنی ایک لاکھ فوج ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے اندر داخل کر دی۔ انھوں نے بزور کویت کو عراق میں ملا کر اعلان کر دیا کہ "کویت عراق کا ۱۹ واں صوبہ ہے۔"

اس کے بعد اقوام متحدہ متحرک ہوئی۔ مختلف ملکوں نے عراق کے اس جارحانہ اقدام کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ امریکہ کی قیادت میں پورے عراق کا فوجی محاصرہ کر لیا گیا۔ عراق کی ۱۵ فی صد آمدنی کا انحصار تیل کی فروخت پر ہے۔ مگر عراقی تیل سے بھرے ہوئے ٹینکر سمندر میں کھڑے ہو گئے، زرعی اور صنعتی پیمانہ کی دھجے عراق فوجی ہتھیاروں سے لے کر دوا اور غذا تک ہر چیز باہر سے منگاتا ہے، ان کا آنا بھی بند ہو گیا۔ اب عراق کے حکمران صدام حسین روزانہ امریکہ کے خلاف تیز و تند بیانات جاری کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اگست ۱۹۹۰) کے مطابق، صدام حسین نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ وہ کویت کی حیثیت کے بارے میں امریکہ سے بات چیت کریں۔ انھوں نے پُر جوش طور پر کہا کہ کیا کویت امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ ہے :

Is Kuwait the 52nd state of the United States?

جواب کی یہی قسم ہے جس کو دھاندلی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کویت اگر امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ نہیں تو وہ عراق کا بھی ۱۹ واں صوبہ نہیں۔ صدام حسین عین اسی چیز کے لیے امریکہ کو متہم کر رہے ہیں جس میں وہ خود شدید تر انداز میں مبتلا ہیں۔

آج دنیا کے بیشتر لوگ اسی قسم کی دھاندلی کر رہے ہیں۔ کاش لوگ جاننے کو اسی بات کی قیمت ہے جو خدا کے یہاں قیمتی ٹھہرے۔ مومن وہ ہے جو ان الفاظ کو آج ہی بے قیمت سمجھ لے جو کل خدا کے یہاں بے قیمت ہونے والے ہیں۔ جو آج آزادانہ طور پر اُس بات کو مان لے جس کو کل وہ مجبورانہ طور پر مانے گا، مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۱

ہندوستانی وقت کے مطابق، آج صبح ساڑھے تین بجے وہ وقت آگیا جس کا اندیشہ تھا۔ امریکی فوجوں نے عراق کے اوپر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ فجر کی نماز سے پہلے بی بی سی (لندن) کے ذریعہ ریڈیو سے یہ خبر معلوم ہو گئی۔ یہ کبھی عجیب بات ہے کہ رات کے وقت عراق میں ایک واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے چند منٹ بعد لندن سے اس کی خبر نشر ہو جاتی ہے اور ایک لمحہ کے اندر ساری دنیا اس کو جان لیتی ہے۔

اپنی مختصر سی زندگی میں دو بڑی جنگیں دیکھنا میرے لیے مقدر تھا۔ دوسری عالمی جنگ جس کا قائد برطانیہ تھا۔ اور پھر موجودہ جنگ جو گویا تیسری عالمی جنگ ہے اور جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ۲۸ ملک عملاً شریک ہیں۔ بقیہ ملکوں کی اکثریت بھی نظری طور پر شریک ہے، کیوں کہ امریکہ نے یہ جنگی اقدام اقوام متحدہ کے فیصلہ کے تحت کیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ باقاعدہ طور پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ کو شروع ہوئی جب کہ ہٹلر کے تحت جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ چند دن کے بعد لاہ آباد کے انگریزی اخبار پائیر (pioneer) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی خبر دیتے ہوئے اس کی جو سرخی قائم کی وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ اس کے الفاظ غالباً یہ تھے :

Poland in Germany's hand

یہ تباہ کن جنگ چند سال تک جاری رہی۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد آخر کار جو ہوا وہ یہ کہ ہٹلر کی دوسری مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ کو اس نے اپنی محبوب عورت کے ساتھ برلن کے کھنڈر پر خودکشی کر لی :

Isolated and reduced to despair, Hitler married his mistress, Eva Braun, on April 30, 1945 and committed suicide with her in the ruins of the chancellery. (19/1011)

بظاہر حالات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے ڈکٹیٹر کا انجام بھی ایک یا دوسری صورت میں وہی ہونے والا ہے جو جرمنی کے ڈکٹیٹر کا ہوا تھا۔ عراق کی طاقت اور امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کی طاقت میں وہی فرق ہے جو جیونیٹی اور ہاتھی میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ عراق کا جنگ میں کوئی نام صرف خودکشی ہے نہ کہ بہادری۔ عراق کے پاس زیادہ تر روایتی ہتھیار ہیں جو اس نے روس سے یا دوسرے مغربی ملکوں سے خرید کر حاصل کیے ہیں جب کہ امریکہ کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ "خریدے ہوئے" ہتھیاروں کے ذریعہ کوئی ملک ایک ایسی قوم پر فتح حاصل نہیں کر سکتا جس نے اپنے ہتھیار خود بنائے ہوں۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمز (۱۸ جنوری) میں سٹرے (A.K. Ray) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار نے صدام حسین کے اقدام کو دیوانگی (madness) اور اہمیت کا غلط اقدام (stupid misadventure) بتایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ صدام حسین کی عظیم فوج کے بارہ میں حال میں جو خبریں چھپی ہیں، وہ سب پر ہنگامے کی باتیں (propaganda ploy) ہیں۔ عراقی صدر کو اپنے غلط اعمال کی بھاری قیمت دینی ہوگی :

The Iraqi President will have to pay a terribly heavy price for his wrongdoings. (p. 13)

مضمون نگار کی یہ بات لفظ بلفظ درست ہے۔ صدام حسین کا اقدام بلاشبہ ہلاکت کی چھلانگ ہے۔ صدام حسین جنونِ عظمت (paranoia) کے مریض ہیں۔ وہ عرب لیڈر بننے کے خط میں مبتلا ہیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ کیا تاکہ الجیز ٹریٹی (۱۹۷۵ء) کو ختم کر کے شط العرب نیز خوزستان پر قبضہ کر لیں۔ مگر اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ ایک ملین انسان مارے گئے۔ بے شمار لوگ زخمی ہوئے۔ عراق کے اوپر ۸۲ بلین ڈالر کا قرض ہو گیا۔ کویت پر حملہ (۲ اگست ۱۹۹۰ء) کے وقت ہر عراقی باشندہ ۴۸۲۴ ڈالر کا مقروض تھا۔ وغیرہ

اٹھ سالہ جنگ میں صدام حسین ایران کو مغلوب نہیں کر سکے تھے مگر اپنے مجنونانہ جوش کی بنا پر انھوں نے اس سے سبق نہیں لیا۔ اور دوبارہ ناقابل فہم حماقت کے تحت عالمی سپر پاور (امریکہ) سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

اس وقت ساری دنیا کے مسلم عوام جذباتی طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ صدام حسین آج مسلم دنیا کے ہیرو ہیں۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے عام مسلمان بھی اسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں صدام حسین مبتلا ہیں۔ وہ اپنے جنونِ عظمت کی تسکین کے لیے صدام کے حامی بن گئے ہیں۔ حقیقی اسلام آدمی کو متواضع بناتا ہے مگر خود ساختہ اسلام آدمی کی انا کو جگا کر اس کو جنونِ عظمت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اپنی اس کمزوری کی بنا پر وہ حقیقت پر ہندی سے دور ہو گئے ہیں۔ وہ ہر اس آدمی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں جو بڑے بڑے الفاظ بولے۔ خواہ عالم واقعہ میں ان الفاظ کی کوئی قیمت نہ ہو۔



خلیج کی جنگ میں پہلی بار جدید وار فیئر کی وہ صلاحیت سامنے آئی ہے جس کو عین نشانہ پر بمباری (pinpoint bombing) کہا جاتا ہے۔ الائیڈ فورس نے بغداد کی ڈیفنس بلڈنگ پر بم مارنا چاہا تو عین اسی مخصوص بلڈنگ پر بم گرا، جب کہ وہاں سیکڑوں دوسری بلڈنگیں بھی موجود تھیں۔ حتیٰ کہ ٹی وی کے گنبد کو نشانہ بنایا تو ان کا بم صرف گنبد سے ٹکرایا اور بقیہ عمارت کو چھوڑ دیا۔ وغیرہ

لندن کی ایک رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جنوری) میں کہا گیا ہے کہ اب تک عراق پر چار ہزار ہوائی حملہ کیے جا چکے ہیں۔ موصولہ تصویریں بتاتی ہیں کہ یہ حملے عین نشانہ پر لگے۔ اس انتہائی صحیح حملہ نے یہاں فوجی لوگوں کے اندر تموج کی کیفیت پیدا کر دی ہے :

At least four of these 4,000 air sorties yielded pictures of the sequence of highly accurate attacks that thrilled the military community, heralding a new era in warfare.

عین نشانہ پر بم کا گرنا ایک بے حد پیچیدہ عمل ہے۔ یہ ابھی تک ایک فوجی راز ہے۔ سادہ طور پر اس کا نظم ایہ ہے کہ پہلے سٹارٹ کے ذریعہ مطلوبہ مقام کا فوٹو لیا جاتا ہے۔ پھر یہ نشانہ عمارت کی تصویر کو ہوائی جہاز میں لگے ہوئے کمپیوٹر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاز فضا میں اڑ کر لیزر شعاعوں کے ذریعہ مذکورہ مقام کو معلوم کرتا ہے۔ کمپیوٹر کے اندر فیڈ کی ہوئی تصویر جب نشانہ کی تصویر سے مطابقت کرتی ہے تو کمپیوٹر مشین کو متحرک کرتا ہے اور بم اس تصویر کی نشانہ پر جا گرتا ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ اور تفصیلی عمل صرف منٹوں کے اندر انجام پاتا ہے۔ فوجی لوگ جب اس قسم کے واقعات کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر جدید ٹیکنالوجی کے بارہ میں تھریل (تموج) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اُس خدا کی قدرت پر تعجب کی کیفیت پیدا ہو جس نے کائنات میں اس قسم کے حیرت انگیز امکانات رکھے اور وہ انسانی ذہن بنایا جو ان امکانات کو استعمال کر کے ایسے کارنامے انجام دے سکے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ عجائب (marvels) جو خالق کی یاد دلانے والے تھے، ان سے انسان صرف مخلوق کی یاد کی غذا حاصل کر رہا ہے۔ ان واقعات سے اگر صحیح سبق لیا جائے تو انسانی دنیا میں ایک حیرت ناک انقلاب برپا ہو جائے۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۸ جنوری) کے پہلے صفحہ پر ایک خبر نمایاں سرخی کے ساتھ چھپی تھی کہ کراچی سے خلیج تک تمام پاکستانی مسلمان امریکہ کی مخالفت اور عدم حسین کی حمایت میں متحد ہو گئے۔ اسی اخبار میں ”امریکہ دشمن نمبر ۱“ کے عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیگراف یہ ہے :

”امریکہ کے صدر ریش کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی بدولت پاکستان کے تمام طبقے اور تمام مکاتب فکر پہلی دفعہ امریکہ دشمنی کے حوالے سے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گئے ہیں۔ اس وقت پوری پاکستانی قوم امریکہ کو عالم اسلام کا دشمن نمبر ۱ سمجھ رہی ہے۔ سمجھتی تو شاید پہلے بھی رہی ہے۔ لیکن اس کا بھرپور اور متفقہ اظہار پہلی دفعہ (امریکہ کے عراق پر حملہ کے بعد) ہو رہا ہے۔“ (صفحہ ۲)

آج کل مسلمانوں کے اخباروں میں بار بار ایسی رپورٹیں اور مضامین چھپ رہے ہیں جن میں ”عالمی اسلامی اتحاد“ کی خبر دی جاتی ہے۔ مگر یہ اتحاد محض ایک منفی اجتماع ہے۔ اور منفی اجتماع اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی اتحاد نہیں۔ وہ محض ایک وقتی قسم کی بھیڑ ہے نہ کہ کوئی حقیقی اور پائیدار اتحاد۔ اس قسم کا اتحاد صرف قوم کی کمزوری کو بتاتا ہے نہ کہ فی الواقع اس کی قوت و طاقت کو۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں جب بھی کوئی بڑا اتحاد ہوا ہے، وہ منفی بنیاد پر ہوا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر ہند کے مسلمان ”خلافت“ کے نام پر متحد ہوئے۔ مگر یہ کوئی مثبت اتحاد نہ تھا، وہ صرف انگریز دشمنی کے جذبہ کے تحت ظہور میں آیا تھا۔ اسی طرح موجودہ صدی کے وسط میں مسلمان لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد ہو گئے۔ یہ اتحاد بھی کوئی مثبت واقعہ نہ تھا۔ وہ تمام تر ہندو دشمنی کے جذبہ کے تحت برپا ہوا تھا۔ اب صدی کے آخر میں مسلمان پھر متحد نظر آ رہے ہیں۔ مگر یہ اتحاد بھی صرف امریکہ دشمنی کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوا ہے، اس اتحاد کے پیچھے کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں۔ اس لیے وہ باقی رہنے والا بھی نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اس قسم کے اتحادی واقعات پر بار بار خوشیوں کے چراغ جلاتے ہیں۔ مگر شام کے جلانے ہوئے چراغ صبح کو بجھ جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ملت بدستور اختلاف و انتشار کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔

مثبت بنیاد پر جمع ہونا حقیقی اتحاد ہے، منفی بنیاد پر جمع ہونا محض ایک بے معنی بھیڑ۔ اتحاد کسی قوم میں شعوری عمل سے آتا ہے اور بھیڑ صرف جذباتی الفاظ سے۔

ٹائم (۱۵-۲۱ جنوری) "گلف اسپٹل" کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ امریکہ اور عراق دونوں اپنی آخری حد پر جا چکے ہیں، اور بظاہر اب دونوں فریق جنگ کے لیے تیار ہیں، کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی اس مفروضہ بدنامی کو اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا کہ اس نے دوسرے کے آگے ہتھیار ڈال دیے (۹-۱۰)۔ ٹائم نے لکھا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں غیر مشروط طور پر واپس بلا لیں، تو یہ ان کے لیے آخری بہترین انتخاب (choice) ہوگا۔ کویت یہ اعلان کر چکا ہے کہ فوجوں کی واپسی کے بعد وہ عراق کی شکایت پر بات چیت کے لیے تیار ہے۔ حتیٰ کہ صدام حسین کے سابقہ مطالبہ کے مطابق، عالمی امن کانفرنس بلانے کا امکان بھی موجود ہے۔

ٹائم کے مطابق، خود امریکہ نے کھلے طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں تو صدام مخالف اتحاد اس کے بعد عراق پر حملہ نہیں کرے گا۔ مزید یہ کہ جارج بش نے اس بات کا بھی اشارہ دیا تھا کہ عراق اپنے سرحدی جھگڑوں کے بارہ میں کویت سے بات چیت کر سکے گا، اور غالباً فلسطین کے مسئلہ پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس بھی منعقد کر سکے گا (صفحہ ۱۲)۔ سویت یونین اور فرانس وغیرہ بھی یہ کہہ چکے تھے کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں ہٹا لیں تو ویسٹ ایشیا کے تمام مسائل کے مجموعی حل (package deal) کے بارہ میں اقوام متحدہ کے تحت کانفرنس کی جائے گی اور تمام مسائل کو حل کیا جائے گا۔ ٹائم نے یہ امکان ظاہر کیا تھا کہ اسرائیل پر دباؤ ڈال کر اس کو راضی کیا جائے گا کہ وہ ویسٹ بینک اور غزہ پٹی کو فلسطینیوں کے لیے خالی کر دے تاکہ وہ وہاں اپنی آسٹیٹ بنا سکیں (صفحہ ۱۳)۔

مگر صدام حسین نے ان تمام تجویزوں کو رد کر دیا۔ یہاں تک کہ جنگ شروع ہوگئی۔ اب مزید کچھ پانا تو درکنار، یہ یقینی ہے کہ صدام حسین کے پاس جو کچھ ہے، اس کو بھی وہ کھودیں گے۔ اس دنیا میں بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی زیادہ کا مطالبہ کرے مگر وہ کم پر راضی ہو جائے۔ مگر اُد کے بغیر فریق ثانی جو کچھ دے رہا ہے، اس پر راضی ہو جانا مزید ترقی کا راستہ کھولتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی اگر کراؤ کا طریقہ اختیار کرے تو وہ حاصل شدہ چیز کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔

جنگ سے پہلے صدام حسین کو جو کچھ مل رہا تھا، جنگ کے بعد وہ اس کو لینا چاہیں گے مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہ پا سکیں گے۔ وقت گزر جانے کے بعد کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی۔



نپلج کی جنگ میں امریکی زیر قیادت جو "ملٹیشنل فورس" بنی ہے، اس میں برطانیہ بھی شامل ہے۔ برطانیہ کے فوجی پائلٹ ٹارنڈو (Tornado) نامی جہاز کے ذریعہ عراق پر حملے کر رہے ہیں۔ کچھ برطانیہ پائلٹوں نے اے پی کے نمائندہ کو اپنے جنگی تجربات بتائے۔

اسکوئڈرن لیڈر مسٹر میسن (Pablo Mason) نے کہا کہ جب ہم دشمن کے اوپر بمباری کرنے کے لیے اڑتے ہیں تو دشمن کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ہر وقت یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ہم خود کسی متوقع یا غیر متوقع حادثہ میں تباہ ہو سکتے ہیں۔ اس وقت سارا معاملہ صرف سکندڑوں کا ہوتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جنوری ۱۹۹۱) کی رپورٹ کے مطابق، پائلٹ میسن نے کہا کہ جنگ کے حالات میں ہمارے اندر مسلسل یہ شعور موجود ہوتا ہے کہ چند منٹوں میں وہ لمحہ آسکتا ہے کہ میں دنیا میں نہ رہوں :

There is a constant awareness that in a few seconds' time you may not exist. (p. 7)

یہ احساس یا شعور جو ایک فوجی پائلٹ کے اندر جنگی حالات کے درمیان ہوتا ہے، وہی مومن کی مستقل زندگی ہے۔ مومن موجودہ دنیا کی زندگی کو امتحان سمجھتا ہے۔ خدا اس کو دنیا میں پیدا کر کے ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہا ہے، جیسے ہی خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی مدت پوری ہوگی، فوراً موت کا فرشتہ آجائے گا تاکہ اس کی روح قبض کرے اور اس کو دنیا سے نکال کر آخرت کے عالم میں پہنچا دے۔

جس آدمی کو یہ احساس ہو کہ اگلے سکندڑ میری موت آسکتی ہے، وہ بے حد چوکنا ہو جائے گا۔ ہر لمحہ کو وہ اپنے لیے آخری لمحہ سمجھے گا۔ وہ جینے سے زیادہ مرنے کو یاد کرے گا۔ وہ آج سے زیادہ کل کی فکر کرے گا۔ وہ آخری حد تک یہ کوشش کرے گا کہ دنیا کے ذریعہ آخرت کو کمائے نہ کہ دنیا کے ذریعہ دنیا کو۔ کیوں کہ دنیا بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ یہ صرف آخرت ہے جو اگلے لمحہ کے بعد اس کے لیے باقی رہے گی۔

"میں اگلے لمحہ نہ رہوں گا" یہ احساس آدمی کے لیے حال کے مقابلہ میں مستقبل کو زیادہ اہم بنا دیتا ہے۔ اس کی ساری توجہ موجودہ کے مقابلہ میں آئندہ کی طرف لگ جاتی ہے۔ وہ دنیا پرستی کو چھوڑ کر آخرت پسند انسان بن جاتا ہے۔

آج کی اہم ترین خبر یہ ہے کہ عراق نے کویت کے تیل کے سیکڑوں کنوؤں میں آگ لگا دی ہے جس کے نتیجہ میں وہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور فضا میں کالا دھواں چھا گیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۳ جنوری) کی پہلی سرخی یہ تھی کہ کویت کے تیل کے کنویں اڑا دیے گئے (Kuwait oilwells blown up) غالباً صدام حسین کو اب یہ یقین نہیں رہا ہے کہ وہ کویت کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے کویت کے تیل کے کنوؤں کو برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔ تاکہ کویت کو چھوڑنا ہو تو اس طرح چھوڑیں کہ وہاں کچھ باقی نہ رہے۔ تقریباً ۳۵ ملین گیلن تیل انھوں نے سمندر میں بہا دیا۔

صدام حسین نے حال میں عراق کے جھنڈوں پر اللہ اکبر لکھوایا تھا۔ وہ اپنی موجودہ جنگ کو اسلامی جہاد کہتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے نعروں سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت اس فریب میں پڑ گئی کہ واقعہ یہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ مگر جو لوگ خدا کی نعمتوں میں آگ لگائیں وہ کبھی اسلام کے مجاہد نہیں ہو سکتے۔ خلیفہ اول نے خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اسامہ کی سرکردگی میں شام کی طرف ہم روانہ کی تو ان کو یہ ہدایت دی کہ تم لوگ وہاں کوئی درخت نہ کاٹنا (لا تقطعوا شجرًا)

جنگ میں "ایک درخت" کاٹنا بھی منع ہے۔ پھر تیل کے کنویں کو جلانا تو اس سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی برائی ہے۔ تیل کے کنویں کو جلانے سے صرف تیل کا قدرتی ذخیرہ ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ اس سے جو دھواں نکلتا ہے وہ اس پاس کی پوری فضا کو مہلک گیس سے بھر دیتا ہے۔ تیل کا ذخیرہ کسی شخص کی ملکیت نہیں۔ وہ انسانیت کے لیے اللہ کا ایک قیمتی عطیہ ہے۔ وہ خدا کی ایک قیمتی امانت ہے۔ انسان اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے مگر وہ اس کو ضائع کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ تیل کے ذخیرہ کو قصداً برباد کرنا خدا کی امانت میں ظالمانہ تصرف کرنے کے ہم معنی ہے جو بلاشبہ ناقابل معافی جرم ہے (تفصیل کے لیے ہانس ریپورٹر، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۱)

صدام حسین نے تیل کے کنوؤں میں آگ لگائی۔ تیل کو سمندر میں بہا کر نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ چڑھیوں اور مچھلیوں تک کے لیے خطرناک مسائل پیدا کر دیے۔ اس کے باوجود مسلمان صدام حسین کو "مجاہد اسلام" کا لقب دے دیے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اسلامی جہاد کا نام لیں مگر وہ اسلام کے احکام پر عمل نہ کریں، ایسے لوگوں کا کس جہاد کا کس نہیں بلکہ سرکشی کا کس ہے۔ وہ سزا کے مستحق ہیں نہ کہ انعام کے مستحق۔



خلیج کی ہولناک جنگ جاری ہے۔ دونوں طرف سے زبردست نقصانات ہو رہے ہیں۔ انسان مارے جا رہے ہیں۔ شہر تباہ ہو رہے ہیں۔ سمندروں اور فضاؤں میں زہریلے اثرات پھیل جانے کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ چڑیاں اور مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مر رہی ہیں۔ اس تباہ کن جنگ پر صرف امریکہ کے زیر قیادت اتحادی فوجوں (الائیڈ فورسز) کا خرچ تقریباً ایک بلین ڈالر روزانہ ہے۔

جنگ لڑنے والے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ وہ انسانی فلاح کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ خلیج کی موجودہ جنگ میں امریکہ کے زیر قیادت ۲۸ ملکوں کا اتحادی گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک کمزور قوم کے ساتھ ایک طاقت ور کی جارحیت کے خلاف لڑ رہا ہے۔ صدام حسین کے نزدیک اس جنگ کا مقصد ماضی کی غلطی کی اصلاح ہے۔ یعنی کویت، جو ان کے نزدیک عراق کا حصہ تھا، اس کو دوبارہ عراق میں شامل کیا جائے۔

۱۸۹۸ میں امریکن۔ اسپینش جنگ چھڑی۔ اس وقت برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے چھ سفیر واشنگٹن میں جمع ہوئے تاکہ امریکہ کے صدر میک کنلی کو جنگ سے اعراض پر آمادہ کریں۔ اس وقت دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی، اس کا خلاصہ امریکی اخبار میں اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ سفیروں نے کہا کہ ہم کو امید ہے کہ انسانیت کی خاطر آپ جنگ نہیں کریں گے۔ صدر نے جواب دیا کہ ہم کو امید ہے اگر ہم جنگ کریں تو یہ عین انسانیت کی خاطر جنگ ہوگی :

Their ambassadors in Washington had a meeting with the US President, and the diplomatic exchanges were summarised by the New York World, of April 8, 1898, thus:

Said the six ambassadors: "We hope for humanity's sake you will not go to war."

Said Mr McKinley in reply: "We hope if we do go to war, you will understand that it is for humanity's sake."

پچھلے پچاس سال میں صرف "تیسری دنیا" میں تین سو چھوٹی بڑی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہر فریق اپنے آپ کو برحق بتاتا ہے۔ یہ صورت حال آخرت کو ایک لازمی اخلاقی ضرورت ثابت کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت نہ آئے تو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ کون شخص حق پر تھا اور کون شخص ناحق پر۔ جنگ جھڑپنا اپنے اختیار میں ہے مگر جب جنگ چھڑ جائے تو اس کی تباہی اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ عقلمند وہ ہے جو جنگ کی نوبت ہی آنے نہ دے۔



ٹائمس آف انڈیا (۲۵ جنوری) میں اردو پریس کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کبھی کے اردو روزنامہ ”اردو ٹائمز“ پر مسلمانوں کے ایک مشتعل ہجوم نے سنگ باری کی۔ اس کی کاپیاں سڑک پر چلائی گئیں۔ اخبار کے ملازمین کو دھمکیاں دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو ٹائمز واحد اردو پرچہ ہے جس نے خلیج کی جنگ میں صدام حسین کی مذمت کی اور سعودی حکومت کی موافقت کی پالیسی اختیار کی۔ عدم برداشت کا یہ مزاج کسی حقیقی صحافت کو وجود میں لانے کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کل تمام اردو اخبارات پر جوش طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کو صلاح الدین ایوبی اور ”صدام مجاہد اسلام“ لکھا جا رہا ہے۔ مسلم علاقوں میں صدام حسین کی تصویریں ہٹا کر ایک کی طرح رکھ رہی ہیں۔ جن اردو اخبارات کی اشاعت بہت کم تھی، انھوں نے صدام حسین کی حمایت میں جذباتی مضامین لکھ کر اپنی اشاعت بہت زیادہ بڑھالی۔ مسلمانوں میں وہی اخبارات مقبول ہو رہے ہیں جن میں اس قسم کی سرخیاں ہوں: ”عراقی مزانوں سے اسرائیل کی نیند حرام“، ”بش نے صدام کے آگے گھٹنے ٹیک دیے“ وغیرہ

مسلم صحافت کا اور مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر مجھے دوسری عالمی جنگ کا واقعا یاد آتا ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ مسلمان انگریزوں سے بے حد متنفر تھے۔ جنگ میں جب ہٹلر کی فوجوں نے برطانیہ پر بم گرائے تو مسلمان بہت خوش ہوئے۔ اخبارات میں ایک اردو شاعر کی نظم چھپ کر بہت مقبول ہوئی۔ اس کا عنوان تھا ”ہٹلر اعظم“۔ اس نظم میں ہٹلر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

خبر لینے بکنگھم کی جواب کی بار سپر جانا ہمارے نام کا بھی ایک گولہ پھینکتے آنا

یہی جذباتیت آج مسلمانوں میں شدت سے ابھرائی ہے۔ مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے سخت نفرت ہے۔ صدام حسین نے عیسائیوں (امریکی) کے بارہ میں کہا کہ تم کو خلیج عرب میں غرق کر دیا جائے گا۔ اور اسرائیل کے اوپر کچھ اسکاڈ (Scud) مزاں اٹل پھینک دیے۔ اس کے بعد مسلمان ایک طرف سے صدام حسین کی حمایت کرنے لگے۔ مگر یہ صرف سطحیت ہے۔ اس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

مسلمانوں کے اس مزاج نے اردو صحافت کو انتہائی حد تک سطحی بنا دیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اردو اخبارات پڑھنے والا آدمی عالمی حقیقتوں سے اتنا ہی بے خبر رہتا ہے جتنا غالب اور ذوق کا دیوان پڑھنے والا آدمی سائنسی علوم سے۔

ہندستان ٹائمس (۲۶ جنوری) میں صدام حسین کے اس محل کی تفصیل چھپی ہے جو انھوں نے بغداد میں بنوایا ہے۔ اس کی سرٹری یہ ہے — صدام اپنے اس محل کے زمانہ میں ایک سال تک رہ سکتے ہیں :

Saddam can live 1 year in his bunker

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بغداد کا یہ صدارتی محل ۱۲۰ فٹ گہرا ہے اور پورا لوہے اور سمنٹ پر بنایا گیا ہے۔ وہ مکمل طور پر ایرکنڈریشمنٹڈ ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر تک لفٹ کا انتظام ہے۔ صدام حسین اس میں ایک سال تک ایٹمی حملے محفوظ حالت میں رہ سکتے ہیں۔ اس میں ایک زمین دوز ذخیرہ آب سے پانی پہنچایا جاتا ہے جو محل سے ۴۰۰ میٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ وغیرہ

ایک فرنچ انجینئر جس نے اس محل کو بنانے میں مدد دی تھی، اس نے کہا کہ جب آپ لفٹ کے ذریعہ اس زمین دوز محل میں اتریں تو آپ ایک نہایت موٹے دروازہ سے گزر کر صدام حسین کے دفتر میں پہنچیں گے۔ صدام حسین کی اندرونی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے کئی ایسے چیمبر سے گزرنا ہوتا ہے جو صرف کوڈ کے ذریعہ کھلتے ہیں۔ اس کے لیے میکینک کارڈ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کے اور بہت سے خفیہ حفاظتی انتظامات ہیں جن کی تفصیل ڈیٹیلڈ ٹیسٹس گراف نے چھاپی ہے۔

اس محل کے اندر ہر قسم کے تمام ضروری سامان کیے گئے ہیں۔ اس کے اندر ایسا کمیونی کیشن نظام ہے کہ صدام حسین اس کے اندر رہتے ہوئے تمام ملک سے اور پوری افواج سے مسلسل ربط قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ یہیں سے اپنی قوم کے نام ٹی وی پر دو گرام نشر کرتے ہیں۔ صدام حسین کوئی چیز اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک کوئی دوسرا شخص ان کے سامنے اس کو چکھ نہ لے۔ فرانسیسی انجینئر نے کہا کہ صدام حسین اس زمین دوز محل میں لمبی مدت تک رہ سکتے ہیں اور یہاں سے جنگ کی رہنمائی کر سکتے ہیں :

Saddam Hussein could survive and function from this emplacement for a long time.

اس قسم کا زمین دوز محل بنا کر ”ام المہارب“ میں فتح کا خواب دیکھنا صرف صدام حسین کی کم عقلی کا ثبوت ہے۔ یہ ”کھیا میں گر پڑنا“ ہے۔ اور جو شخص کھیا میں گر پڑے اس کا گڑا اس عالم اسباب میں کبھی تیار نہیں ہوتا۔



کو متفقہ طور پر مسلمانوں کا سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ خلیج کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد ۲۲-۲۵ جمادی الآخرہ ۱۴۱۱ھ (۹-۱۱ جنوری ۱۹۹۱) کو مکہ میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس میں سعودی عرب کے اور تمام دنیا کے علماء جمع ہوئے۔ تین دن کے غور و بحث اور مشورہ کے بعد "اعلان مسکتہ المسکونۃ الی الامۃ الاسلامیۃ" جاری ہوا۔ میرے سامنے اس کا وہ مستند متن ہے جو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة (۷ جنوری ۱۹۹۱) میں سات صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس رواد کا عنوان یہ ہے — عراقی فوج کے نام پیغام، صدام کی نافرمانی شرعی طور پر واجب ہے (رسالة الی الجیش العراقی، عصیان صدام واجب شرعی)

رپورٹ کے مطابق، علماء کی موثر نے متفقہ طور پر صدام کے خلاف یہ پکار بلند کی کہ تم فوراً کویت سے نکل جاؤ (اخرج یا صدام حسین من الکویت - اخرج الآن ولیس غدا) اس میں کہا گیا ہے کہ عراقی فوج پر لازم ہے کہ وہ ظالم صدام کی اس کے ظلم میں حمایت نہ کرے (الواجب علی جیش العراق الایطیع الظالم فی ظلمہ) علماء اسلام کی اس عالمی کانفرنس نے متفقہ طور پر ساری دنیا کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ صدام حسین کا ساتھ نہ دیں، وہ خلیج میں صدام حسین کے اقدام کی مذمت کریں جس کے نتیجہ میں امریکہ اور مغربی طاقتوں کو خلیج میں آنے کا موقع ملا۔ اسی طرح دہلی میں بھی ہندوستانی علماء کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں بھی وہی باتیں کہی گئیں جو مکہ کی کانفرنس میں کہی گئی تھیں۔

اصولاً میں علماء کی اس پکار سے متفق ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پکار کے باوجود یہ ہوا کہ تقریباً ساری دنیا کے مسلمان صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی بھی ملک کے مسلمانوں نے ان اعلانات اور ان اپیلوں کی پروا نہیں کی۔ عراق کی فوج کے بارہ میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ صدام حسین کا ساتھ دینے کے لیے مجبور تھی۔ مگر مسلم عوام تو آزادانہ طور پر خود اپنے فیصلہ کے تحت صدام حسین کے حامی بنے ہوئے ہیں۔ مسلم علماء اور مسلم عوام کے درمیان علیحدگی کی اتنی بڑی مثال تاریخ میں کوئی اور نہیں ملتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مسلم علماء اور مسلم رہنماؤں نے ان قوموں کے خلاف مسلم عوام کو اتنا متفرق کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اب اس معاملہ میں غیر جذباتی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ "نفرت مغرب" کی جو نفسیات مسلمانوں میں پیدا کی گئی ہے، اس کا نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکلا۔



عراقی لیڈر کی بلند بانگ تقریریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ عرب کے مصر کا امیر کیوں اور اتحادیوں کا قبرستان بنادیا جائے گا۔ اس طرح کی باتیں مسلمانوں کو مجاہدانہ معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری طرف سعودی عرب کے شاہ فہد کی بات مسلمانوں کو کمتر محسوس ہوتی ہے، کیونکہ انھوں نے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے اتحاد کر لیا ہے۔ آج ایک صاحب نے بتایا کہ جامع مسجد کے ملازمین دیواروں پر ایسے پوسٹر لگائے گئے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے: سعودی اور یہودی ایک سر کے دو رخ۔ ایک مسجد میں نماز ختم ہوئی تو ایک مسلمان نے ہاتھ اٹھا کر کہا: خدایا، سعود اور یہود کو ہلاک کر دے۔

خلیج کی نزاع میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، اس کو سمجھنے کے لیے احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس معاملہ میں سعودی عرب حق پر ہے اور دوسرا گروہ ناحق پر۔

امام الترمذی نے عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ قرینہ ملتا ہے کہ آخر زمانہ میں حق جزیرہ عرب کی طرف ہوگا۔ اس روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین حجاز میں پناہ لے گا جس طرح سانپ اپنی بل میں پناہ لیتا ہے (إن الدین لیسائر الی الحجاز کماتأرزل الحیة الی جحرها) جامع الاموال فی احادیث الرسول، ۹/۲۴۱

دوسری روایت میں موجودہ حالات کے بارہ میں براہ راست اشارہ ملتا ہے۔ امام ابو داؤد نے ”کتاب الملام“ میں نقل کیا ہے کہ ذو جبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم آئندہ روم (عیسائیوں) سے پُر امن صلح کرو گے۔ پھر تم اور وہ دونوں ایک اور دشمن سے لڑو گے۔ پھر تم لوگوں کو فتح ہوگی۔ تم غنیمت حاصل کرو گے اور سلامت رہو گے۔ پھر تم لوگ واپس ہو گے، یہاں تک کہ تم ایک چراگاہ میں ٹھہرو گے جہاں ٹیلے ہوں گے۔ اس وقت عیسائیوں میں سے ایک شخص صلیب اٹھائے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آئی۔ پھر مسلمانوں میں سے ایک شخص کو غصہ آئے گا، وہ صلیب کو توڑ دے گا۔ اس وقت روم (عیسائی) عہد کو توڑ دیں گے اور جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے (سنن ابی داؤد، ۴/۱۰۹)

ان احادیث کی موجودگی میں مسلمانوں کی موجودہ روش یقینی طور پر درست نہیں۔ یہ صرف خواہش پرستی ہے نہ کہ قرآن و سنت کی پیروی۔

انڈیا کے ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر ایس نہال سنگھ غلٹی جنگ کے زمانہ میں بغداد میں تھے۔ انھوں نے اپنے کچھ تجربات ہندوستان ٹائمس (۲۹ جنوری) میں شائع کیے ہیں۔  
وہ لکھتے ہیں کہ وہ کچھ اور صحافیوں کے ساتھ بغداد کے ممتاز ہوٹل الرشید میں مقیم تھے۔ مگر اس کا حال یہ تھا کہ کسی بھی بل کی ادائیگی کے لیے صرف امریکی ڈالر ہی واحد قابل قبول سکہ تھا۔ یہاں امریکی انتہائی نفرت کی علامت تھا، مگر عملاً امریکی ڈالر ہی بغداد پر حکومت کر رہا تھا:

"Much as the United States was the hated symbol of Western might, the dollar ruled Baghdad."

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ آج امریکہ اور ترقی یافتہ مغربی ممالک نے کس طرح تمام ذرائع پر قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ امریکہ جانیے تو آپ دیکھیں گے کہ جو مسلمان امریکہ سے نفرت کرتے ہیں، وہی اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے امریکہ کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلم دنیا کو جدید سائنسی میدانوں میں ترقی یافتہ بنایا جائے۔ مگر اس رخ پر کسی بھی مسلم ملک میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں کو پٹرول کا خزانہ دے کر وہ اقتصادی طاقت دے دی تھی جس کے ذریعہ مسلم دنیا اپنے ترقیاتی منصوبوں کو مکمل کر سکے۔ مگر اس قدرتی خزانہ کو کچھ ممالک عیش و عشرت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اور کچھ ممالک یہ کر رہے ہیں کہ مغربی ملکوں سے خطرناک ہتھیار خرید کر خود مسلم ملکوں کے خلاف، جارحانہ کارروائی کریں جس کی بدترین مثال وہ ہے جو عراق نے پیش کی ہے۔

صدام حسین کو پٹرول کی صورت میں مفت کی دولت مل گئی۔ اس دولت کو انھوں نے عراق کی ترقی میں نہیں لگایا۔ انھوں نے یہ کیا کہ روس، جرمنی، فرانس وغیرہ سے مہلک ہتھیار خرید کر پڑوسی ملکوں کو چیلنج کرنے لگے۔ اس کے برعکس اگر وہ اس قدرتی دولت کو ملک کی ترقی میں لگاتے تو عین ممکن تھا کہ عراقی سکہ بھی وہی اقتصادی اہمیت حاصل کر لے جو آج امریکی ڈالر کو حاصل ہے۔

مسلمانوں کی بربادی کا سبب ان کی یہی داخلی کمزوری ہے نہ کہ کوئی بیرونی سازش۔ جو لوگ بیرونی سازشوں کی خبریں چھاپتے ہیں وہ صرف اپنی بے خبری کا ثبوت دے رہے ہیں۔



لندن کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ لندن کے تمام مسلمان خلیج کے موجودہ بحران میں صدام حسین کے حامی ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے مسلمان جن کو سعودی عرب سے پیسہ ملتا ہے، وہ سعودی عرب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو کوئی دلیل نہیں۔ اس بات کو الٹ کر اگر میں یہ کہوں کہ جو لوگ صدام حسین کے حامی ہیں ان کو عراق کی حکومت نے پیسہ دے رکھا ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ میں نے کہا کہ صدام حسین کو اگر حملہ کرنا تھا تو انھوں نے اسرائیل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کویت پر کیوں حملہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں عراق کے سفیر سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کویت پر کیوں حملہ کیا۔ سفیر نے کہا کہ اصل میں تو ہم اسرائیل پر حملہ کرنا چاہتے تھے، ہم نے سعودی عرب اور کویت سے کہا کہ اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دو، مگر وہ ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے ہم کو ایسا کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ آپ کو بغیر عراق سے پوچھنا چاہیے تھا کہ جب آپ نے سعودی عرب اور کویت کی حمایت کے بغیر ایران اور کویت پر حملہ کر دیا تو اسی طرح آپ ان کی حمایت کے بغیر اسرائیل پر بھی حملہ کر سکتے تھے۔

پھر انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ عراقی سفیر کے بیان کے مطابق، عراق کو یہ خطرہ تھا کہ جب وہ اسرائیل پر حملہ کرے گا تو امریکہ کی فوجیں خلیج میں عراق کے خلاف آجائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ کو عراقی سفیر سے دوبارہ کہنا چاہیے تھا کہ امریکی فوج تو کویت پر حملہ کی صورت میں بھی مکمل طور پر خلیج میں آگئی ہے۔ پھر جس طرح کویت پر حملہ کے وقت آپ نے امریکی فوج کی آمد کی پروا نہیں کی، اسی طرح آپ اسرائیل پر حملہ کے وقت بھی امریکی فوج کی آمد سے بے پروا ہو کر اسرائیل کے خلاف اپنی فوجی کارروائی کر سکتے تھے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ کتنی زیادہ سطحی ہوگئی ہے اور مسلمانوں کے لیڈر کس طرح مسلمانوں کی کم فہمی کا استغلال کر رہے ہیں۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ذاتی محرک کے تحت ایک اقدام کرتا ہے اور پھر اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اصول کی زبان بولتا ہے۔ وہ اپنی قیادت قائم کرنے کے لیے ہنگامے کھڑے کرتا ہے اور اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا عنوان دیتا ہے۔ وہ قومی خواہش اور مادی مفاد کے تحت عمل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ حق کی خاطر ایسا کر رہا ہے۔ ایسے لوگ سرکشی کی حد تک مجرب ہیں خواہ اپنی تبرید کے لیے وہ کتنے ہی خوب صورت الفاظ بولتے رہیں۔

ہندستان ٹائمز (۳۱ جنوری) میں نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ————— مسلمانوں کو مغرب کی طرف سے غضب ناک رد عمل کا اندیشہ :

#### Muslims fear backlash

اس رپورٹ میں دوسرے حوالوں کے ساتھ مسٹر کلیم خواجہ کا بیان نقل کیا گیا ہے۔ وہ امریکہ کی ایسوسی ایشن آف انڈین مسلمس کے پریسیڈنٹ ہیں۔ امریکہ میں اس وقت ایک لاکھ (100,000) ہندوستانی مسلمان رہتے ہیں۔ تاہم جو مسئلہ پیدا ہوا ہے وہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خلیج کی جنگ اور اس معاملہ میں مسلمانوں کے عام رویہ نے مغرب کی کئی قوموں میں ان کے خلاف سخت نفرت اور غصہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اس صورت حال کا شکار ہو رہے ہیں جس کو مسٹر خواجہ نے نسلی غضب ناک (racist backlash) کا نام دیا ہے۔ مغربی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کو نہ صرف تحقیر کا تجربہ ہو رہا ہے بلکہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات بھی ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پر جوش مظاہروں نے خلیج کی جنگ کو اسلام اور عیسائیت کی جنگ بنا دیا ہے۔ اس نے غیر ضروری طور پر لوگوں میں صلیبی دور کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔

مسٹر کلیم خواجہ نے اپنے بیان میں کہا کہ انہیں یہ پریشانی بھی ہے کہ خلیج کی جنگ سے پیدا شدہ اس صورت حال کا اثر جنوب ایشیائی ملکوں (مسلم ممالک) کی اقتصادیات پر بھی پڑے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا ایک فوری اثر یہ متوقع ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی طرف ملنا لوجی کی آمد رک جائے گی۔ یہ ان ملکوں کے لیے ترقی میں رکاوٹ کے ہم معنی ثابت ہوگا :

One immediate effect that can be expected, will be a halt of the supply of technology to third world countries. That will prove to be a major setback. (p. 14)

امریکہ کے مسلم لیڈر کو موجودہ حالات کا یہ خطرناک نتیجہ نظر آتا ہے کہ مغربی ملکوں سے مسلم ملکوں کی طرف ملنا لوجی کے آنے میں رکاوٹ پڑے گی۔ مگر میری نظر میں اس سے بڑا خطرہ دعوتی ہے۔ خلیج کی جنگ میں مسلمانوں کے پر جوش رویہ نے مسلمانوں اور مغرب کی مسیحی قوموں کے درمیان جو نفرت پیدا کی ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ان قوموں کے اندر اسلام کی اشاعت کا عمل رک جائے گا۔ یا کم از کم اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔



یکم فروری ۱۹۹۱

ایک صاحب ایک اردو ماہنامہ لے کر آئے اور کہا کہ اس کے شذرات کو پڑھئے۔ اس میں لکھا ہوا تھا: ”امریکہ کے سخت رویہ اور مسلمانوں کو کھیل دینے کی پالیسی نے عرب کی سرزمین کو اس وقت میدان کارزار میں تبدیل کر دیا ہے جہاں مانند آب مسلمان کا ہوا رزاں ہو گیا ہے اور تثلیث کے فرزند حکم کھلا میراث خلیس میں در اندازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ نبی آخر الزماں کا ارشاد ہے کہ اخرجوا الیہود والنصارى من جزیرة العرب (جزیرہ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو) اور قرآن مجید میں ان سے عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے (لا تتخذوا الیہود والنصارى اولیاء) مگر آپ کے پیروؤں اور خالص وارثوں نے ان کو اپنا طلیف بنا لیا ہے۔ اور اب ان کا لشکر جزیرہ العرب میں دن دناتا پھر رہا ہے۔ اور مسلمانوں کے اہم اور مرکزی شہر ناکامی اور ہیر و شبھا بنتے جا رہے ہیں“ (معارف فروری ۱۹۹۱)

میں نے انھیں عربی ہفت روزہ الدعوة کے شمارے (۳۱ جنوری، ۲۱ فروری ۱۹۹۱) دکھائے۔ ان میں ایضاً ابن باز نے اضطراب کے اسلامی اصول کے تحت غیر مسلم حکومتوں سے تعاون لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر وہ بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ جو مولوی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ سب سودیہ کے نمک خوار ہیں، وہ امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔

بہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، خاص طور پر ان کے ”لکھنے اور بولنے والے طبقہ“ کا عام انداز ہے۔ یہ لوگ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اختلاف رائے پیش آتے ہی وہ طنز و تفسیریں اور عیب جوئی اور الزام تراشی کا انداز اختیار کر لیتے ہیں وہ تنقید کا جواب صرف تعصیب سے دینا جانتے ہیں۔ اسلام میں صرف یہود و نصاریٰ کے جغرافیائی اخراج کا حکم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نفسیاتی امراض کے قلبی اخراج کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان سے بغض نہ رکھے۔ وہ انسانیت میں مبتلا نہ ہو۔ وہ بے انصافی نہ کرے، وہ دوسرے کا بدخواہ نہ بنے۔ وہ استقامی جذبہ کو اپنے دل سے نکال ڈالے۔ وہ کسی کی کردار کشی نہ کرے۔ کسی کی نیت پر حملہ نہ کرے۔ وہ کسی کی طرف غلط بات منسوب نہ کرے۔ وہ کسی کی بربادی کے درپے نہ ہو۔

مگر اس دوسرے ”اخراج“ سے کسی کو کوئی دل چسپی نہیں۔ جغرافیائی اخراج کے چیمپین قلبی اخراج کے معاملہ میں بے حقیقت ثابت ہو رہے ہیں۔

۲ فروری ۱۹۹۱

ٹائمز آف انڈیا (۲ فروری) میں سوشل لال کا ایک آرٹیکل چھاپا ہے۔ خود آرٹیکل میں تو کوئی گہری بات نہیں، البتہ اس کا عنوان مجھے پسند آیا جو ان الفاظ میں ہے — لڑائی جیتو اور امن بار دو :

Win the War; Lose the Peace

خلیج کی جنگ میں پچھلے دو ہفتہ کے اندر تقریباً پچاس بلین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ یہ نقصان مزید بڑھتا رہے گا۔ جنگ میں خواہ جو فریق جیتے، جہاں تک امن کا تعلق ہے، وہ بہر حال کمویا جا چکا ہو گا۔ جنگ دیش کی جنگ (۱۹۷۱) میں انڈیا جیت گیا۔ مگر اس کے بعد ملک میں تشدد اور مہنگائی اور کرپشن کا جو طوفان آیا اس نے امن اور سکون کو ہمیشہ کے لیے غارت کر دیا۔

یہی حال خلیج کی جنگ کے بعد بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہونے والا ہے۔ اس جنگ میں فتح کا تمغہ جس فریق کو بھی ملے، عام انسان کی مصیبتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ اور مصیبتیں عالمی ہوں گی، حتیٰ کہ اس کا برا اثر اس ملک تک بھی پہنچ جائے گا جس نے جنگ کے بعد فتح کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

جنگ خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، وہ مسائل کے حل کے نام پر لڑی جاتی ہے، مگر ہر جنگ صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے بالکل صحیح کہا کہ مسائل ہمیشہ وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو مسائل حل کرنے کے لیے سرگرم ہوتے ہیں :

Problems are created by problem-solving activity.

جنگوں کی تاریخ میں معلوم طور پر ایک ہی استثنائی نمونہ ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ پیغمبر اسلام کا دوسروں سے ٹکراؤ پیش آیا۔ مگر آپ نے جنگ کا طریقہ اتنا کم استعمال کیا کہ عملاً اور مقابلہ وہ جنگ نہ کرنے کے برابر ہے۔ اس کے باوجود آپ نے انسانی مسائل کو اتنے کامیاب طور پر حل کیا کہ تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

پیغمبر اسلام کے ساتھ وہ تمام احوال پیش آئے جن کے نام پر جنگ کی جاتی ہے۔ مگر آپ نے جنگ کے بجائے امن کی طاقت سے ان کا مقابلہ کیا۔ مسلمان اگر اپنے پیغمبر کی اس سنت کو زندہ کریں، وہ دنیا کو دوبارہ دکھائیں کہ امن کی طاقت کس طرح سب سے بڑی طاقت ہے تو وہ نہ صرف خود اپنی جنگ لڑائی کے بغیر جیت لیں گے، بلکہ اس ربانی طریقہ کا مظاہرہ کر کے وہ قوموں کے امام بن جائیں گے۔

آج کل اخبارات کا پہلا صفو خلیج کی جنگ کی خبروں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید خصوصی صفحات صرف اسی جنگ کے بارہ میں ہوتے ہیں جن کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے: غلیبی جنگ (The Gulf War) ہندستان ٹائمس (۲ فروری) کا صفحہ ۱۱ اسی قسم کا ایک صفحہ ہے۔ اس میں حسب معمول خلیج کی جنگ سے متعلق خبریں شائع ہوتی ہیں۔

جنگ کی ہلاکت کی خبروں کے درمیان ایک بلا عنوان خبر چار سطروں میں ہے۔ وہ یہ ہے — ایک شخص جس پر الزام تھا کہ اس نے ۱۹۸۸ء سے اب تک نیویارک کے راشٹر علاقہ کی ۱۰ عورتوں کو قتل کیا ہے، اس کو عدالت نے ۲۵۰ سال قید کی سزا دی ہے جو امریکی قانون میں ایسے مجرم کی کم سے کم سزا ہے :

A man convicted of killing ten Rochester area women in New York since 1988 has been sentenced to a minimum of 250 years in prison.

اخباری ترتیب میں بظاہر سب سے چھوٹی خبر ہے۔ شاید ہی کسی پڑھنے والے نے اس خبر کو پڑھا ہو۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بلاشبہ سب سے بڑی خبر ہے۔ ہلک جرم کی سزا جو ملکی قوانین میں مقرر کی گئی ہے، وہ گویا انسانی ضمیر کی آواز ہے۔ یہ سزائیں دراصل انسانی ضمیر کا قانونی اظہار ہیں۔

انسانی ضمیر یہ چاہتا ہے کہ قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے۔ یا کم از کم لمبی مدت تک کے لیے اس کو پُر مشقت قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسانی ضمیر کے مطابق، ان لوگوں کی سزا کتنی زیادہ سخت ہونی چاہیے جو ایسی جنگ برپا کرتے ہیں جس میں لاکھوں افراد ہلاک ہوں۔ کروڑوں انسان زخمی اور اپالٹ ہو جائیں۔ زندگی کے قیمتی وسائل بے حساب مقدار میں برباد ہوں۔ خشکی اور مندر اور فضا سب فساد سے بھر جائیں۔ جن قدرتی ذرائع کو خدا نے انسانیت کی تعمیر کے لیے پیدا کیا ہے، ان کو انسانیت کی تخریب میں ضائع کر دیا جائے۔ مذکورہ قاتل مزید ۲۵۰ سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا انسانی عدالت ایک انفرادی مجرم کو بھی سزا دینے کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جو لوگ ساری انسانی نسل پر ہلاکت کا عذاب انڈیل دیں، ان کو سزا دینا کس کے اختیار میں ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ موجودہ محدود دنیا کے بجائے ایک اور لامحدود دنیا ظہور میں آئے۔ لامحدود دنیا میں قائم ہونے والی عدالت ہی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے سرکش انسانوں کو بھرپور سزا دے سکے۔



خلیج کی جنگ، ۱ جنوری کو شروع ہوئی۔ اس وقت سے رات دن مسلسل بم باری کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر دو ہفتہ تک سارا معاملہ تقریباً ایک طرف رہا۔ اتحادی جہاز عراق کے اوپر آگ برساتے رہے اور صدام حسین اور ان کی فوج زمین دوز بکروں کے نیچے بیٹھی رہی۔

۲۰ جنوری کو اس میں تبدیلی آئی۔ عراق کی زمینی فوج نے اپانک پیش قدمی کر کے سعودی عرب کی سرحدی پستی انجمنی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد اتحادیوں کی زمینی اور ہوائی فوج متحرک ہوئی۔ دو دن تک ”گھسان کی لڑائی“ کی خبریں آتی رہیں۔ آخر عراقی فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ بڑی تعداد میں عراقی ہلاک ہوئے۔ کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگے۔

جنگ کے ایک ماہر نے کہا ہے کہ انجمنی کی جنگ عراقیوں کے لیے الٹی پڑے گی۔ اس سے پہلے امریکہ اور اس کے ساتھی عراق کی زمینی فوج سے ڈرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ زمینی جنگ میں عراق کو زیر کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مگر انجمنی کے تجربہ نے انھیں عراقی فوج کی کمزوریوں (weaknesses) کو بتا دیا۔ اس جزئی جنگ میں اتحادیوں نے پایاکہ عراقی فوج کا کمیونی کیشن کا نظام بہت کمزور تھا۔ اسی طرح عراقی فوجیوں میں مہارت (skill) کی کمی بہت کم نظر آئی۔ مزید یہ کہ انھوں نے محسوس کیا کہ عراقی فوجی دل سے لڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ عراقی فوجی لڑائی میں اتنے سخت نہیں تھے جتنا کہ خیال تھا کہ وہ ہوں گے :

...they were not as tough as we thought they might be

تازہ رپورٹ کے مطابق، انجمنی کے بعد امریکی فوج کے حوصلے بہت بلند ہو گئے ہیں اور اب وہ منصوبہ بنا رہے ہیں کہ پوری طاقت کے ساتھ کویت اور عراق پر حملہ کر کے کم سے کم مدت میں عراقی فوج کو تباہ کر دیں۔ انجمنی کے واقعہ نے عراقی فوج کا بھرم ختم کر دیا۔ اب تقریباً یقینی نظر آ رہا ہے کہ عراقی فوج امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا مقابلہ زمینی جنگ میں نہیں کر پائے گی اور رسوا کن شکست سے دوچار ہوگی۔

خواہ دو آدمیوں کا معاملہ ہو یا دو قوموں کا معاملہ، دھاگ کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ آدمی اگر لڑکر جیتنے والا نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ خاموش بیٹھا رہے۔ نہ لڑنے سے کم از کم یہ ہوتا ہے کہ وہ فریقِ ثانی کے اوپر اپنی دھاگ قائم رکھتا ہے، جب کہ جنگ چھڑنے کی صورت میں وہ جنگ بھاڑ جاتا ہے اور اسی کے ساتھ دشمن کی نظر میں وہ اپنی دھاگ بھی کھو دیتا ہے۔

۵ فروری ۱۹۹۱

ریاض کے مشہور عربی ہفت روزہ الدعوة (۲۲ رجب ۱۴۱۱ھ) میں خلیج کی جنگ کے بارے میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الحماقة سلاح ایضا (یوقونی بھی ایک ہتھیار ہے) اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مغرب کے فوجی افسروں میں سے ایک سے پوچھا گیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار صدام حسین کی بے وقوفی اور اس کا طیش اور جنون ہے۔ اور انھیں چاہیے کہ وہ اس ہتھیار سے فائدہ اٹھائیں تاکہ وہ جلد فتح حاصل کر سکیں :

سئل احد القادة العسكريين الغربيين عن ابرز الاسلحة واشد هافتك في يد القوات الدولية المتحالفة۔ فقال ان ابرز سلاح في ايدي القوات المتحالفة هو غباء صدام وحيلته وجنونه وان عليهم ان يستثمروا هذا السلاح ليتمكنوا من تحقيق نصر سريع (صفحہ ۱۰)

اس پر میں یہ اضافہ کروں گا کہ کوئی بھی شخص بے وقوف نہیں ہوتا۔ مشہور قول کے مطابق، کسی چیز کے لیے بڑھی ہوئی محبت آدمی کو اندھا اور بہرہ رانا دیتی ہے (جبك الشيء يعمى ويصم) صدام حسین کی اصل کمزوری ان کا جنون عظمت ہے۔ اپنے آپ کو بڑا دیکھنے کے شوق نے ان کو جنون بنا دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ایسے اقدامات کر ڈالتے ہیں جو ان کی واقعی طاقت سے باہر ہوتے ہیں۔

۱۹۷۹ء میں عراق کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مسلسل اسی قسم کی احمقانہ کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۰ء میں انھوں نے الجزائر معاہدہ (۱۹۷۵ء) کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر کے ایران پر حملہ کر دیا اور آٹھ سال تک بے فائدہ اس سے لڑتے رہے۔ اسی طرح ۲ اگست ۱۹۹۰ء کو انھوں نے اچانک کویت پر حملہ کر کے اپنے آپ کو اتنی بڑی مشکل میں پھنسا لیا جس سے نپٹنے کی طاقت ان کے اندر نہیں۔

ایمان آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے، اور جس آدمی کے اندر تواضع کی صفت پیدا ہو جائے وہ ہر قسم کی حماقتوں سے بچ جائے گا۔ وہ ایسی طاقت بن جائے گا کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کو زیر نہ کر سکے۔ حماقت اکثر حالات میں اپنے آپ کو بڑا سمجھ لینے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایمان آدمی کو بڑائی کے جذبہ سے بچا لیتا ہے، اس لیے ایمان آدمی کو احمقانہ کارروائی سے بھی بچا لیتا ہے۔

مزائل (missile) سب سے پہلے جرمنوں نے دوسری عالمی جنگ میں استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد روس اور امریکہ وغیرہ نے اس کو مزید ترقی دے کر خطرناک قسم کے دور مار ہتھیار کی حیثیت دے دی۔ یہ ایک پیچیدہ مشین ہے جس کے سرے پر دھماکہ نیز چیزیں نصب ہوتی ہیں۔ اس کو لانچر کے ذریعہ دور کے نشانہ پر پھینکا جاتا ہے۔ اس کی رفتار ریڈیو کی لہروں کے ذریعہ کنٹرول ہوتی ہے۔ وہ نہایت تیز پٹاؤ کی طرح فضا میں اڑتے ہوئے مطلوبہ نشانہ پر جا کر گرتا ہے۔

جرمن مکنا لوجی کو مزید ترقی دے کر روسیوں نے ایک خطرناک مزائل بنایا جس کو اسکلڈ (Scud) کہا جاتا ہے۔ یہ اسکلڈ مزائل عراق نے بڑی تعداد میں سوویت روس سے خرید کر حاصل کیے اور ان کو مزید ترقی دے کر اس قابل بنایا کہ ان کو دور کے نشانوں پر مارا جاسکے۔

عراق کے صدر صدام حسین کو اپنے اسکلڈ مزائل پر بہت اعتماد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسکلڈ کی صورت میں ان کے پاس ایسا ہتھیار ہے کہ وہ حیران کن طور پر اپنے دشمنوں پر ضرب لگا سکتے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے دوران انھوں نے ان کو مسلسل استعمال کیا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن اسکلڈ مزائل انھوں نے اسرائیل کے شہروں (جیفہ اور تل ابیب) پر پھینکے۔ اتنے ہی اسکلڈ انھوں نے سعودی عرب (نہران اور ریاض) نیز بحرین پر پھینکے۔ مگر عملاً ان کے اسکلڈ مزائل غیر موثر ہو کر رہ گئے۔ کیوں کہ امریکی ”پیٹریٹ“ نے ان کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے مار کر گرادیا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ روس نے جب اسکلڈ مزائل بنائے تو امریکہ نے بھی ریسرچ شروع کر دی کہ اس کا توڑ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے ایک جوابی مزائل تیار کیا جس کو پیٹریٹ مزائل کہا جاتا ہے۔ پیٹریٹ





مزال میں یہ صلاحیت تھی کہ جس وقت اسکڈ اپنے لانچر سے نکل کر روانہ ہو، عین اسی وقت پیٹرٹ بھی اڑ کر تیزی سے اس کی طرف روانہ ہو، اور اسکڈ ٹے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو ناکارہ کر دے۔ چنانچہ حیلج کی جنگ کے دوران عراق نے کئی درجن اسکڈ مزال استعمال کیے۔ مگر امریکی پیٹرٹ ہر بار فضا میں پہنچ کر درمیان ہی میں اس سے ٹکرا گیا اور نشانہ پر پہنچنے سے پہلے اس کو ناکارہ بنا دیا۔

نیچے کی تصویر میں دونوں مزالوں کو عمل کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک طرف عراق سے اسکڈ مزال روانہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف عین اسی وقت اسرائیل کے امریکی فوجی اڈے سے پیٹرٹ مزال اڑتا ہے اور وہ راستہ میں اسکڈ مزال سے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو برباد کر دیتا ہے۔

پیٹرٹ مزال کے اس عمل میں مصنوعی سیارہ سے لے کر زمینی کنٹرول اسٹیشن تک نہایت پیچیدہ نظام شامل رہتا ہے۔ تاہم پیٹرٹ کی کامیابی کا خاص راز اسکڈ مزال کی ایک کمزوری ہے۔ اسکڈ کی خود اپنی ایک کمزوری نے امریکہ کو موقع دیا کہ وہ اس کا کامیاب توڑ تیار کر سکے۔

اسکڈ جب تیزی کے ساتھ فضا میں گزرتا ہے تو وہ نہایت سخت قسم کی گرمی پیدا کرتا ہے۔ یہ گرمی اسکڈ کی کمزوری ہے۔ پیٹرٹ فضا میں اٹھ کر اسی گرمی کا پھینکا کرتا ہے۔ پیٹرٹ میں ایسا مادہ ہوتا ہے جو گرمی کی طرف کھنچے۔ چنانچہ وہ گرمی کی رہنمائی میں اسکڈ تک پہنچ جاتا ہے اور اس سے ٹکرا کر اس کو درمیان ہی میں برباد کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز کی ایک کمزوری ہے۔ ہر چیز خود اپنے ساتھ اپنا ایک توڑ لیے ہوئے ہے۔ اگر آپ اس توڑ کو جان لیں تو ہر چیز کا مقابلہ نہایت کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر مخالف چیز کو خود اسی کے ہتھیار کی مدد سے شکست دے سکتے ہیں۔



۷ فروری ۱۹۹۱

روزنامہ ہندستان ٹائمز (۷ فروری) میں سعودی عرب کے سابق آئل منسٹر احمد ذکی یحیٰی کا ایک بیان پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ تیل کی وجہ سے ہے، انھوں نے سویڈش روزنامہ (Svenska Dagbladet) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں جس کے ہاتھ میں تیل کے ذرائع ہوں گے، وہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوگی :

...in future the power which will have oil resources in its hands will be the superpower of the world.

انھوں نے کہا کہ خلیج فارس چونکہ تیل کے عالمی ذخیرہ کا ۵۰ فی صد حصہ رکھتا ہے، خلیج میں امریکی غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ امریکہ اس کے ذریعہ اس قابل ہو جائے گا کہ وہ مستقبل کے بین الاقوامی حالات میں تیل کو ایٹم کے بدل کے طور پر استعمال کر سکے :

...because the Persian Gulf has 75 per cent of the entire resources of the world, a U.S. domination of Gulf oil would mean it would be able to use as an alternative to atomic bomb in future international developments (p. 12).

مزید یہ کہ آج ہی کے اخبار میں امریکی صدر مسٹر جارج بوش کا ایک بیان چھپا ہے۔ انھوں نے واشنگٹن میں کہا کہ خلیج کی جنگ امریکہ کی آخری جنگ ہوگی۔ اس کے بعد نئے عالمی نظام کی وجہ سے کوئی اور جنگ لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی :

...the Gulf war would be America's last war. There would be no need to fight another one because of the new world order (p. 12).

دور اول میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار دیا۔ اس کے ذریعہ وہ ساری دنیا میں اسلام کا دبیرہ قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ اللہ کی مدد سے مسلم دنیا کے نیچے تیل کا قدرتی خزانہ نکل آیا جو صنعتی دور میں سپر پادربنانے کا ذریعہ ہے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ ان کے اثاثہ کے ذریعہ دوسری قوم عالمی سپر پادربن رہی ہے اور خود مسلمانوں کے حصہ میں مغلوبیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

خارجی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے داخلی طاقت درکار ہے، داخلی کمزوری کے ساتھ خارجی مواقع کو استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ داخلی طاقت کے بغیر خارجی مواقع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص کا جسم ہو مگر اس سے اس کی روح نکل گئی ہو۔

قومی آواز (۸ فروری) اور دوسرے اخبارات میں یہ رپورٹ چھپی ہے کہ پاکستان کی سیاست اس وقت ایران میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت خلیج کے مسئلہ میں سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے مگر وہاں کے عوام پر جوش طور پر صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے وزیراعظم نواز شریف نے ۵ جنوری کو سارے ملک میں یوم کشمیر منایا۔ اس کا مقصد خطیبی مسئلہ سے عوام کی توجہ کو ہٹانا تھا۔ مگر حکومتی سطح پر اس کو کامیاب کرنے کی ساری کوششوں کے باوجود یوم کشمیر کامیاب نہ ہو سکا۔

یہی صورت حال زیادہ بڑے پیمانہ پر عرب دنیا کی ہے۔ وہاں واضح طور پر مسلمان دوحصوں میں بٹ گئے ہیں۔ خواص کا ایک طبقہ سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے۔ مگر عوام بالکل طوفانی انداز میں صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال موجودہ زمانہ کی مسلم قیادت کی ایک بہت بڑی کمزوری کو بتاتی ہے۔

اور وہ ہے : سیاست کو حقیقت پسندانہ بنیاد پر چلانے کے بجائے جذباتی بنیادوں پر چلانا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد فلسطین کا جو مسئلہ پیدا ہوا وہ بلاشبہ ایک سنگین مسئلہ تھا، اس معاملہ میں صحیح رویہ یہ تھا کہ قول اور عمل میں تناسب کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ہم چلائی جاتی۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگوں نے یہ کیا کہ عملی امکانات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے رہے۔ پچھلے پچاس برس میں ان کا حال یہ رہا کہ تقریر اور تحریر کے ہر موقع پر ”قبلہ اول“ کے معاملہ میں لوگوں کو جذباتیت کی خوراک دیتے رہے۔ یہاں تک کہ مشرق سے مغرب تک تمام مسلم عوام فلسطین کے مسئلہ میں آخری حد تک جذباتی ہو گئے۔

موجودہ مسلمان اسی قسم کی لفظی جذباتیت پر مبنی ہوئی قوم تھے۔ صدام حسین نے اسی کا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے کہا کہ ”تم فلسطین کو یہودیوں سے غالی کرو، اس کے بعد ہم بھی کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے“۔ صدام حسین کا یہ بیان محض ایک خوش نما نعرہ تھا، مگر مسلمان، جن کو پہلے ہی نعرہ پسند بنایا جا چکا تھا، وہ عین اپنے مزاج کے تحت اس لفظی نعرہ کی طرف دوڑ پڑے۔

سیاست کا تعمیری طریقہ یہ ہے کہ کسی معاملہ میں عوام کو ضرورت سے زیادہ حساس نہ بنایا جائے۔ جب بھی ایسا کیا جائے گا تو یہی ہوگا کہ عوام بنجیدہ معاملہ کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے اور جس چیز میں انھیں بالذات حساسیت میں مبتلا کیا گیا ہے اس کی طرف ہجوم کر کے دوڑ پڑیں گے۔



دکتور عبدالرحمن العومنی کویت کی حکومت کے ایک وزیر ہیں۔ وہ امیر کویت کے خصوصی نمائندہ کے طور پر نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے حکومت ہند کے ذمہ داروں سے ملاقات کی۔ ۸ فروری ۱۹۹۱ کو انھوں نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کی۔ اس کی تفصیلات آج کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں۔

دکتور العومنی نے اس کا اعتراف کیا کہ اس وقت مسلم دنیا میں صدام نوازی کا طوفان آیا ہوا ہے اور امریکہ کو ظالم قرار دے کر اس کی مذمت کی جا رہی ہے۔ مگر اس کی وجہ سوچ کا فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو شروع نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ۲ اگست ۱۹۹۰ سے ہی شروع ہو چکی تھی جب کہ عراق نے جارحیت کر کے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا (قوی آواز، ۹ فروری ۱۹۹۱)۔

کویتی وزیر کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جنگ کا آغاز صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کیا، اس لیے ہم کو صدام حسین جارح نظر آتے ہیں۔ مسلم عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ جنگ کا آغاز امریکہ نے ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو کیا۔ اس لیے انھیں نظر آتا ہے کہ اس معاملہ میں زیادتی امریکہ کی طرف ہے۔

اس کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ صرف خلیج کی موجودہ لڑائی کی بات نہیں ہے، یہی تمام نزاعات کی بات ہے۔ جو لوگ نزاع کے آغاز کو "۲ اگست" سے شمار کرتے ہیں وہ ایک فریق کو ذمہ دار بتاتے ہیں، اور جو لوگ نزاع کا آغاز "۱۷ جنوری" سے کرتے ہیں ان کے نزدیک ساری ذمہ داری دوسرے فریق کے غامہ میں چلی جاتی ہے۔

نزاع کی ہر کہانی میں پہلے عمل ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس کا رد عمل۔ اس طرح اس کا ایک نصف اول ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا نصف ثانی۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس طرح کے معاملہ میں پوری کہانی کو نہیں بتاتے۔ ہر آدمی اس حصہ کو لے لیتا ہے جو اس کے موافق ہو۔ کوئی حصہ اول کو نمایاں کرتا ہے، اور کوئی حصہ ثانی کو۔

جب بھی دو فریقوں میں کوئی ٹکراؤ یا فساد پیدا ہوتا ہے تو اس واقعہ کا ایک "۲ اگست" ہوتا ہے اور ایک اس کا "۱۷ جنوری"۔ جو لوگ واقعہ کو ۲ اگست کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو ایک فریق غلطی پر نظر آتا ہے، اور جو لوگ واقعہ کو ۱۷ جنوری کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو دوسرا فریق غلطی پر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم اسلامی نقطہ نظر سے "۲ اگست" والا فریق ہی غلط ہے، کیونکہ: **الْبِدْءُ اَظْلَمُ** (آغاز کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

۱۰ فروری ۱۹۹۱

پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے امن مشن کے تحت چھ مسلم ملکوں کا دورہ کیا۔ جنوری ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں وہ ایران، ترکی، شام، اردن، مصر اور سعودی عرب گئے۔ ہر جگہ وہ حکومت کے سربراہوں سے ملے اور خلیج کی جنگ کو روکنے کے لیے بات چیت کی۔ ہندوستان ٹائمس (۱۰ فروری) کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ”گلف پیس مشن“ کے تحت دوسرے دورہ پر روانہ ہوئے ہیں۔ اس دورہ میں وہ الجزائر، مراکش، تیونس اور لیبیا جائیں گے۔ اس سلسلہ میں وہ اسلام آباد میں عراقی سفیر اسماعیل جودی حسین سے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔ اردن کے شاہ حسین کے ذریعہ انھوں نے اپنا پیغام صدام حسین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

پاکستانی روزنامہ نوائے وقت (۲ فروری ۱۹۹۱) کے صفحہ اول کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر نواز شریف نے اسلام آباد میں وزیر اعظم سکرٹریٹ میں ملک کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین اور دوسرے ممتاز سیاست دانوں سے خلیج کی صورت حال پر گفتگو کی اور اپنے ”امن مشن“ کی تفصیلات سے انھیں آگاہ کیا۔ ”وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ ہم نے صدر صدام حسین سے صرف تین لفظوں کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ یہ کہہ دیں کہ آئی دل و دودرا (I will withdraw) تو پھر باقی کام آسان ہو جائے گا۔“ یعنی میں کویت سے اپنی فوج واپس بلا لوں گا۔

مسٹر نواز شریف کا یہ بیان صرف ان کی سادہ لوحی کاشتوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذکورہ تین لفظ آئی دل و دودرا کی بات نہیں، بلکہ ایک اور تین لفظ آئی واز رائگ (I was wrong) کی بات ہے۔ اور یہ دوسرا تین لفظ ایسا ہے جس کو کہنے والا آج کی دنیا میں کوئی نہیں، حتیٰ کہ خود پاکستان کے اسلام پسند لیڈر بھی نہیں۔ ”میں نے غلطی کی“ کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ دراصل اپنے آپ کو رد کرنا ہے۔ یہ خود اپنی زبان سے اپنی نفی کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ جملہ کہنے کے لیے بہت بڑا حوصلہ درکار ہے۔ چونکہ لوگوں میں اتنا بڑا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس جملہ کو اپنی زبان سے دہرانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔

آدمی جب ایک بات بول دے یا وہ ایک اقدام کر بیٹھے تو اس کے بعد وہ اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنے کو غلط کہا یا اپنے اقدام کو واپس لیا تو لوگوں کی نظر میں بیعت ہو جاؤں گا۔ یہ اندیشہ اس کو اعتراف سے روک دیتا ہے۔ اپنے خیالی وقار کو بچانے کے لیے وہ اپنے پورے وجود کو اور بعض اوقات پوری قوم کو تباہی کے گڑھے میں گرادیتا ہے۔

عراق کے حکمران صدام حسین نے ۱۹۸۰ میں اپنی فوجیں ایران کے اندر داخل کر دیں۔ اس وقت ان کا نعرہ تھا کہ الطريق الى القدس يمر بيطهران (قدس کا راستہ تہران سے گزرتا ہے) مگر آٹھ سال کی باہمی لڑائی کے بعد ۱۹۸۸ میں دونوں کے درمیان جنگ بندی ہوئی تو حال یہ تھا کہ قدس پر یہودیوں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ البتہ دو مسلم ملکوں کی آپس کی جنگ میں دونوں طرف کے لاکھوں آدمی مارے گئے اور کھربوں روپے کی دولت ضائع ہو گئی۔

صدام حسین نے دوسری بار اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کر دیا۔ کویت ایک بے حد چھوٹا ملک تھا، وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔ چنانچہ عراق کی فوجیں اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گئیں۔ اس جارحانہ اقدام کے متعلق بھی دوبارہ صدام حسین کا نعرہ ہے کہ الطريق الى القدس يمر بيطهركويت (قدس کا راستہ کویت سے گزرتا ہے) دونوں بار مسلم دنیا کے بہت سے لوگ اس نعرہ کے فریب میں آ گئے۔ انھوں نے صدام حسین کی حمایت کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یقین کر لیا کہ صدام حسین تہران اور کویت سے سو کریر وشلیم میں داخل ہونا چاہتا ہے تاکہ قدس (بیت المقدس) کو آزاد کرائے۔ ان مسلمانوں میں سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ صدام حسین کو اگریر وشلیم پر قبضہ کرنا تھا تو ان کو بغداد سے سیدھے یر وشلیم کی طرف مارچ کرنا چاہیے تھا، انھوں نے اس مقصد کے لیے یہ طریقہ کار استعمال کیا کہ پہلے تہران اور کویت پر قبضہ کرو، اس کے بعد یر وشلیم کی طرف اقدام کرو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی بے شعوری ہے جس کی وجہ سے وہ جھوٹے نعروں کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اگر مسلمان ایک باشعور قوم ہوتے تو وہ صدام حسین کے جارحانہ اقدام کی کجی حمایت نہ کرتے مگر مسلمانوں کی بے شعوری کی وجہ سے صدام حسین کو مسلم دنیا میں اپنے بہت سے حامی مل گئے۔

اسی بے شعوری کی بنا پر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف الفاظ کو جانتے ہیں، معانی کی انھیں خبر نہیں۔ وہ باتوں کو صرف ظاہری سطح پر دیکھتے ہیں، وہ باتوں کو اندرونی سطح پر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے جذبات سے واقف ہیں مگر خارجی دنیا کے حقائق کا انھیں پتہ نہیں۔ وہ سچے اقتدار اور جھوٹے اقدام کا فرق نہیں جانتے۔ اور جو لوگ سچے اقدام اور جھوٹے اقدام کا فرق نہ جانیں، ان کو کوئی بھی چیز بربادی کی پھلانگ سے بچانے والی نہیں۔

اس دنیا میں ”فرق“ کو جاننا سب سے بڑی دانائی ہے۔ اور فرق کو نہ جاننا سب سے بڑی نادانی۔



”المجلة“ ایک عربی ہفت روزہ ہے۔ وہ جدہ میں چھپتا ہے اور لندن سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ فروری ۱۹۹۱ میں کویت کے ایک وزیر الدکتور عبدالرحمن العوضی کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو کے سوالات و جوابات کا تعلق خلیج کی موجودہ صورت حال سے ہے۔

المجلد کے نمائندہ نے دکتور العوضی سے پوچھا کہ آئندہ کویت کا مستقبل داخلی اعتبار سے کیا ہوگا؟ کیف سیکون مستقبل الکویت داخلیا؟ دکتور العوضی نے اس کا جواب دیا، اس کا ایک جزیرہ تھا کہ میں چاہیے کہ ہم ماضی کے تجربہ سے سبق سیکیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور شاید سب سے بڑی غلطی جس میں ہم مبتلا ہوئے، وہ یہ تھی کہ ہم نے ایسے شخص کے اوپر اعتماد کیا جو اس کا مقصد نہ تھا۔ ینبغی ان نعلم من درو سنا السابقة ونستفید منها۔ ولعل اہم خطا وقعنا فیہ هو وضع ثقتنا فی من لا یستحقھا) صفحہ ۲۷

کویت نے عراقی صدر کو اپنا عرب بھائی سمجھ کر ان کے اوپر اعتماد کیا اور بلینوں ڈالر کے ذریعہ ان کی مدد کی۔ مگر عراقی صدر نے اپنے آپ کو طاقتور بنا کر خود اپنے منحن کے اوپر حملہ کر دیا۔ چنانچہ اب کویت کے ذمہ دار اعلان کر رہے ہیں عراقی صدر بھروسہ قابل نہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے مسلمانوں نے عراقی صدر کی تقریروں سے متاثر ہو کر دوبارہ ان کے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ کر لیا ہے۔ وہ ان کو اپنا حمایتی اور اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلم عوام حال میں وہی غلطی کر رہے ہیں جو کویتی حکمرانوں نے ماضی میں کی۔ دونوں نے عراقی صدر کی باتوں کی بنیاد پر ان کے بارہ میں اپنی رائے قائم کی۔ حالانکہ اصل قابل لحاظ چیز کردار ہے نہ کہ بات۔ امام مالک نے قائم بن محمد تابعی کے بارہ میں نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے : ادرکت الناس وما یعجبون بالقول۔ میں نے ایسے لوگ (صحابہ) دیکھے ہیں جو قول کو کچھ بھی انما یُنظرُ الی عملہ ولا یُنظرُ الی قولہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دراصل آدمی کا عمل ا قولہ (موطا، صفحہ ۷۰۲) دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا۔

کتنا زیادہ فرق ہے صحابہ کی سوچ میں اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ میں۔

۱۳ فروری ۱۹۹۱

نوائے وقت (۱۳ فروری) میں ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کا مضمون چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تلخج کی جنگ نے پاکستانی عوام کو جذبات کی رو میں بہا دیا۔ وہ حقائق کو طوطا رکھ کر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک صدام حسین اسلام کے ہیر وہیں اور انھوں نے فلسطین کے مسئلہ کو زندہ کیا ہے۔ کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ کویت تو عراق ہی کا حصہ تھا۔ اس کو ۱۹۱۸ میں انگریز نے اس سے علیحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا درجہ دے دیا۔

مضمون نگار کے جواب کا ایک پیرا گراف یہ ہے: اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انگریز نے اپنی مصلحت کے تحت ۱۹۱۸ میں کویت کو عراق سے علیحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں تبدیل کیا تب بھی ایسا کہنا حقیقت کا تقاضا نہیں۔ اس طرح تو پاکستان بھی ۴۴ سال پہلے ہندوستان کا حصہ تھا۔ اور بھارت والے یہ موقف اختیار کر سکتے ہیں کہ انگریز نے اپنے مفاد کے لیے اس کو ہندوستان سے کاٹ کر ایک علیحدہ ریاست بنا دیا، یہ کہہ کر وہ زبردستی پاکستان پر قبضہ کر لیں۔ ایسا خیال تاریخی اور واقعاتی طور پر درست نہیں۔ (مضمون) اسی کا نام دہرا منطق ہے، اور دہرا منطق مسلمانوں کا خاص مزاج ہے۔ کویت پر عراقی قبضہ کے لیے وہ جس منطق کو درست سمجھتے ہیں، اسی منطق کو پاکستان پر ہندوستانی فلسطین پر یہودی قبضہ کے لیے درست ماننے پر تیار نہیں۔

لکھنؤ کے عربی پریچر الرائد (یکم فروری ۱۹۹۱) نے محمد و جدی قنبدیل کا ایک مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے — تلخجی لڑائی کا ذمہ دار کون (من المسئول عن الحرب) مضمون نگار نے تلخج کی جنگ کے تباہ کن نقصانات کا ذکر کیا ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ جنگ کی اس آگ کو بھڑکانے کا ذمہ دار کون ہے، وہ کون ہے جس نے عراق کے اوپر جہنم کے دروازے کھول دیے۔ حقائق بتاتے ہیں کہ یہ صدام حسین ہیں جو اس جنگ کا سبب بنے۔ عراقی لیڈر شپ ہی اس ہیبت ناک المیہ کی ذمہ دار ہے جس کا سامنا عراق کو ہے (التقييد العرفية هي التي تتحمل المسؤولية عن المأساة السريعة التي يتعرض لها العراق) مضمون یہ بات اسلامی اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں سبب کو دیکھا جاتا ہے نہ کہ نتیجہ کو۔ اس طرح کے معاملات خواہ جہاں بھی ہوں، صاحب سبب کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

مگر یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے کہ آدمی ایک جگہ ایک دلیل استعمال کرے اور دوسری جگہ دوسری دلیل۔ ایک معاملہ میں وہ ایک طریقہ کا حامی ہو اور دوسرے معاملہ میں وہ دوسرے طریقہ کی حمایت کرنے لگے۔



۱۴ فروری ۱۹۹۱

لندن سے شائع ہونے والے عربی المجلدہ (۱۳-۱۹ فروری ۱۹۹۱) میں الدکتور حسین معلا کا انٹرویو چھپا ہے۔ موصوف نے جامعہ بغداد میں میڈیکل تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک زمانہ میں وہ صدام حسین کے ذاتی معالج رہ چکے ہیں۔

دکتور معلا نے جنگ کے نتیجے میں عراق کی تباہی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عراقی قوم آج سخت ترین مصیبت میں مبتلا ہے۔ اور یہ بلاشبہ ہر انسان کے لیے تکلیف دہ ہے۔ مگر ان مصیبتوں کا اصل ذمہ دار انھوں نے "اتحادی طاقتوں" کو نہیں قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری تمام تر عراقی لیڈر شپ پر ہے۔ عراق صدام حسین کے جرائم کی قیمت ادا کر رہا ہے (العراق يدفع ثمن جرائم صدام حسین) صفحہ ۴۲ اسی طرح ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة (۱۴ فروری ۱۹۹۱) میں اس کے "الحمر السیاسی" کے قلم سے دو صفحوں کا ایک جائزہ چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ کے نتیجے میں فلسطینیوں کو نفاذ بل تلافی نقصان پہنچا ہے، وہ ان عرب ملکوں سے کٹ گئے جو بلٹیوں ڈالر کے ذریعہ مسلسل ان کی مدد کر رہے تھے اور اپنے یہاں ان کو عزت کی جگہ دیے ہوئے تھے۔ وہ اس قسم کے تمام فوائد سے محروم ہو گئے۔

اس نقصان اور محرومی کا سبب عرب ممالک یا کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود فلسطینیوں کی اپنی قیادت ہے۔ فلسطینی قوم نے بہت ہنگامی اور بہت بھاری قیمت ادا کی ہے، اور اس کا سبب بعض فلسطینی لیڈروں کا وہ وقت ہے جو انھوں نے کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں صدام حسین کے جرائم کی تائید کر کے اختیار کیا۔ (ان الشعب الفلسطينى دفع الثمن غالیا وباهظاً بسبب الموقف الذى اقتضتہ بعض القيادات الفلسطينیة بتأيید اجرام صدام حسین فى احتلالہ لدولة الكويت) صفحہ ۸

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف کویت اور عراق سے نہیں ہے بلکہ ساری دنیا سے ہے۔ ہر جگہ (بشمول ہندستان) آج مسلمانوں کو جن مشکلات اور مصائب کا سامنا ہے، ان سب کی واحد ذمہ داری موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں پر آتی ہے نہ کہ مغزوضہ "اسلام دشمنوں" پر۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں نے، تقریباً بلا استثناء، مسلمانوں کی نہایت غلط رہنمائی کی۔ وہ ان کو جذباتی نعروں پر دوڑاتے رہے۔ اس کے نتیجے میں خود ان لیڈروں کو تو شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔ مگر مسلم عوام کے حصہ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ ان کی مشکلات میں مزید بے پناہ اضافہ ہو گیا۔



۱۵ فروری ۱۹۹۱

آج کی ڈاک سے لاہور کا ہفت روزہ آئین (فروری ۱۹۹۱) ملا۔ یہ جماعت اسلامی پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۲۶ جنوری کو جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس میں خلیج کے مسئلہ سے متعلق ایک قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

قرارداد میں کہا گیا ہے کہ امریکہ خلیج کی یہ جنگ اپنے سامراجی مقاصد اور سیاسی عزائم کے لیے کر رہا ہے۔ اس کو فوری طور پر بند ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ "یہ پوری دنیا کے مسلمانوں اور امن پسند انسانوں کے دل کی پکار ہے۔ اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں اور عراق دونوں کو خمد اور ہٹ دھرمی کی روش ترک کر کے امن کی اس اپیل پر لبیک کہنا چاہیے۔"

جماعت اسلامی کی یہ اپیل میرے نزدیک کھوکھلے الفاظ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ کیوں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا یہ ظالمانہ اقدام اپنے ذاتی انٹرسٹ کے تحت ہوا ہے، اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو وہاں کوئی بھی اپنی ضد کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ خود مذکورہ اپیل کرنے والے لوگ بھی نہیں۔

اس کی ایک مثال خود پاکستان کا واقعہ ہے۔ پاکستان کے سابق فوجی صدر جنرل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو پر مقدمہ چلا کر عدالت سے پھانسی کا فیصلہ حاصل کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اور جماعت اسلامی نے پوری طرح اس معاملہ میں جنرل ضیاء الحق کی تائید کی۔ جب مسٹر بھٹو کی پھانسی کا اعلان ہوا تو تمام دنیا کے ممالک (بشمول مسلم ممالک) نے اپیل کی کہ بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے۔ مگر جماعت اسلامی اور جنرل ضیاء الحق نے اس عمومی اپیل کی پروا نہ کی اور بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو کا زندہ رہنا ان کی اپنی سیاسی موت کے ہم معنی ہوگا۔

آج تمام لوگوں کا یہ حال ہے کہ جہاں ان کا ذاتی انٹرسٹ ہو وہاں وہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ ایسے لوگ دوسروں کو کس طرح نصیحت کر سکتے ہیں کہ تم اپنے انٹرسٹ کو نظر انداز کر کے دوسروں کی بات سنو اور اپنے اقدام کو واپس لے لو۔ لوگوں کے پاس دوسروں کے لیے اصول ہے اور اپنے لیے مفاد۔ اس معاملہ میں لوگوں کا حال وہی ہے جو برطانوی ادیب ڈبلیو ایس لینڈر (۱۸۶۴-۱۷۷۵) نے کہا تھا کہ ہم اصول کی بات کرتے ہیں مگر ہم مفاد پر عمل کرتے ہیں :

We talk on principle, but we act interest.

المجلد (۱۳-۱۹ فروری) میں ایک احتجاجی جلوس (تظاہرہ) کی تصویر ہے۔ یہ امریکہ میں بسنے والے عراقیوں کا جلوس ہے۔ وہ مختلف تختیاں اٹھائے ہوئے سڑک پر چل رہے ہیں۔ ایک تختی پر لکھا ہوا ہے :

الجمالیۃ العرقلیۃ غیر مسئلۃ عن جرائم صدام (عراقی مہاجرین صدام کے جرائم کے ذمہ دار نہیں)

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ میں تین ملین عرب ہیں۔ ان میں ۸۰ ہزار عراق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان عربوں کی دوسری نسل (بیٹوں اور پوتوں) میں اپنے قبیلہ وطن سے زیادہ گہرا لگاؤ نہیں مگر پہلی نسل جو عرب سرزمین میں پیدا ہوئی تھی، وہ اپنے آبائی وطن سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے، ایک امریکی عرب نے کہا :

ہا انا اری وطنی الذی اخترتہ آج میں دیکھتا ہوں کہ جس وطن کو میں نے اختیار کیا اور وطنی الذی ولدت فیہ یتحاربان۔ جس وطن میں میں پیدا ہوا دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے بیٹوں اور پوتوں ہا انا اری وطن اولادی واحفادی فی حرب مع وطن آبائی واحجدادی کا وطن میرے باپ اور دادا کے وطن سے برسرِ جنگ ہے۔

(صفحہ ۵۸)

اسی طرح عرب اصل سے تعلق رکھنے والے (نیز دوسرے ملکوں کے مسلمان) بڑی تعداد میں فرانس، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں آباد ہیں۔ ہر جگہ وہ اسی نفسیاتی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں یہ لوگ شک کی نظر سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مقامی باشندے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جگہ جگہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ساری دنیا میں مسلمانوں کا دہی حال ہو چکے گا جو حال ان کا ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا ہے۔ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ مسلمان عزت اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر اب وہ ان ملکوں میں ذلت اور مشکلات کے درمیان رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس کی ذمہ داری اگرچہ وہ مغرب کی مفروضہ "اسلام دشمنی" کے خانہ میں ڈالیں گے مگر باعتبار حقیقت اس کی ذمہ داری خود مسلم لیڈروں کے سوا کسی اور کے اوپر نہ ہوگی۔ ————— دورِ اول کے مسلمان دوسرے ملکوں میں دعوتِ اسلام کے لیے گئے۔ انہوں نے دوسرے ملکوں کے مسائل کو حل کیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسرے ملکوں میں طلبِ معاش کے لیے گئے۔ وہ خود مسائل کا شکار ہو کر رہ گئے۔



۱۷ فروری ۱۹۹۱ء

ٹائٹس آف انڈیا (۸ جنوری) کے ایڈیٹوریل کی سرخی یہ تھی: پکیں امریکانا (Pax Americana) یعنی امریکی امن۔ میڈیٹرینین کے علاقہ میں رومیوں نے وسیع سلطنت قائم کی جو ۲۷۰ ق م سے لے کر ۱۸۰ء تک رہی۔ اس زمانہ میں رومی اقتدار کے تحت اس علاقہ میں جو سیاسی امن قائم ہوا اس کو انھوں نے پکیں رومانہ تعبیر کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی سیاست میں امریکہ کو غالب کردار ادا کرنے کا جو موقع ملا اس کی بنا پر اس عہد کو پکیں امریکانا سے تعبیر کیا جانے لگا۔ مگر اس دور میں امریکہ کے علاوہ سوویت یونین کو بھی سپر پاور کی حیثیت حاصل رہی۔ اس بنا پر پکیں امریکانا کا لقب صرف جزئی طور پر ہی امریکہ پر صادق آتا تھا۔ اب حالات مکمل طور پر بدل گئے ہیں۔ ٹائٹس آف انڈیا نے اپنے مذکورہ ایڈیٹوریل میں بالکل درست طور پر لکھا ہے کہ دو طاقتی دنیا کا نظام جس کو سرد جنگ نے پیدا کیا تھا وہ نومبر ۱۹۸۹ء میں دیوار برلن کے ساتھ ڈھ گیا۔ اس کے گھنڈے سے ایک واحد طاقتی دنیا کا نظام ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ غلجی جنگ نے اس عمل کو حیران کن رفتار کے ساتھ تیز کر دیا ہے :

The bi-polar world order created by the Cold War collapsed along with the Berlin Wall in November 1989. A more and more uni-polar world began to emerge from the rubble. That process has now accelerated with dizzying speed. (p. 1)

آج ٹائٹس آف انڈیا (۷ فروری) میں فرانسسیسی مورخ (Amaury de Riencourt) کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صدیوں کے تاریخی عمل اور امریکہ کی غیر معمولی مادی ترقی جس طرف جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ آنے والا دور پکیں امریکانا کا دور ہو۔ یہ امریکہ کا شاہانہ مقدر ہے کہ وہ بیسویں صدی کا روم بنے :

It is America's imperial destiny to be the Rome of the twentieth century (p. 12).

یہ بات بطور واقعہ درست ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے دانش مندی یہ ہے کہ وہ امریکہ کی سیاسی چٹان سے اپنا سر نہ ٹکرائیں۔ بلکہ اسلام کے دعوتی مشن کو لے کر اٹھیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو عین ممکن ہے کہ دور امریکہ مستقبل میں دور اسلام بن جائے۔ کوئی بھی غلبہ دعوتی مواقع کو ختم نہیں کرتا۔ اور جہاں دعوتی مواقع موجود ہوں وہاں گویا وہ سب کچھ موجود ہے جس کی اسلام کو ضرورت ہے۔



ہندستان ٹائمس (۸ فروری) میں ایک خوش کن خبر شائع ہوئی ہے۔ واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی اس خبر کا عنوان ہے۔۔۔۔۔ خلیج کی جنگ کے بعد کسی بھی منصوبہ میں انڈیا اپنا رول

India wants a role in post-war plan

چاہتا ہے:

خبر میں بتایا گیا ہے کہ نئی دہلی کی ہدایات کے تحت امریکہ کے ہندستانی سفیر مسٹر عابد حسین امریکہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ (فار پالیٹکل ایفرس) مسٹر رابرٹ کیمٹ (Robert Kimmit) سے ملے۔ ہندستانی سفیر نے امریکی حکومت سے یہ درخواست کی کہ جنگ کے بعد ویٹ ایشیا کی بحالی کا جو نقشہ بنایا جائے، اس میں انڈیا کی رائے کو بھی شریک کیا جائے۔ علاقہ کی تعمیر نو کے پراسس میں انڈیا کا بھی بطور ایک پارٹنر شامل کیا جانا ضروری ہے۔

ہندستانی سفیر نے مسٹر کیمٹ سے کہا کہ انڈیا جیسا ایک ملک اس علاقہ میں نہایت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ اور امریکہ کو چاہئے کہ وہ انڈیا کی ترقی میں مزید بہت زیادہ دلچسپی لے:

A country like India in the subcontinent has to play an extremely important role, and the US have got to take a lot more interest in India's development. (p. 12)

موجودہ حالت میں یہ درخواست محض نادانی کی ایک خواہش ہے جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ اسی اخبار کے صفحہ اول پر یہ خبر ہے کہ خلیج کے لئے جانے اور آنے والے امریکی ایروفرس کے ٹرانسپورٹ جہازوں کو بمبئی اور مدراس کے ایروپورٹ پر دوبارہ تیل لینے کی سہولت (refuelling facility) دی جا رہی تھی۔ لیکن ہندستان کے سیاسی لیڈروں نے اس پر شور مچایا۔ چنانچہ حکومت ہند نے اس سہولت کو بند کر دیا۔۔۔۔۔ جس عمل میں انڈیا قیمت تیل دینے کے بعد بھی شریک نہ ہو، وہ اس عمل کے بعد اس کے انجام کی تشکیل میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔

اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ جو لوگ جو کھم کو برداشت کریں، وہی جو کھم کے بعد آنے والے نتیجہ کے مالک ہوں۔ موجودہ دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ جو کھم کوئی اور اٹھائے اور اس کا نتیجہ کسی دوسرے کو مل جائے۔ اس قسم کی خوش فہمی صرف ایک سادہ لوح انسان کے ذہن میں جگہ پاسکتی ہے۔ اس کے باہر ایسی خوش فہمی کا کوئی وجود نہیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ فروری) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ بحرین کے ایک انٹرنیشنل ہسپتال میں ایک لطیفہ مشہور ہو رہا ہے کہ ایک پیٹرٹ روزانہ استعمال کر د اور اسکو کو دور بھگاؤ :

A Patriot a day keeps Scuds away

سوویت یونین نے اسکو کے نام سے خطرناک قسم کے دور مار میزائل بنائے۔ عراق نے ان کو بڑی تعداد میں خرید کر اپنے یہاں جمع کر لیا۔ عراق کے لئے ان کی حیثیت بے پناہ ہتھیار کی تھی۔ ان کے ذریعہ وہ سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں پر قیامت ڈھا دیتا۔ اس نے ظہران اور ریاض وغیرہ پر بہت سے اسکو پھینکے۔ مگر یہ شہر تباہی سے بچ گئے۔ اس کی وجہ امریکہ کے پیٹرٹ میزائل تھے۔ جنہوں نے نقص ہی میں عراقی اسکو سے ٹکرا کر انھیں تباہ کر دیا۔

سوویت یونین نے جب اسکو بنائے تو امریکہ نے اس کے اس اہم فوجی راز کو دریافت کیا اور اس کا کوڑ تیار کرنے کے لئے ریسرچ شروع کر دی۔ اسی ریسرچ کا نتیجہ پیٹرٹ تھے۔ اسکو جب آواز سے چھ گنا زیادہ تیز رفتار کے ساتھ فضا میں اڑتا ہے تو پیٹرٹ فوراً ہی اس کا پتہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اسکو اپنے لائحہ عمل کو نشانہ کی طرف چلتا ہے، عین اسی وقت پیٹرٹ بھی مخالف سمت سے اس کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ پیچھا کر کے اسکو سے ٹکرا جاتا ہے اور اس کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے برباد کر دیتا ہے۔

امریکہ کی سازش اور دیسہ کاری انہیں، بلکہ اس کی اسی قسم کی صلاحیت ہے جس نے اس کو خلیج میں آنے کا موقع دیا ہے۔ عربوں کے پاس عراقی اسکو کا کوئی توڑ نہ تھا۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ امریکہ کو دعوت دیں۔ حتیٰ کہ اسی ٹائمس آف انڈیا میں واشنگٹن پوسٹ کے حوالہ سے یہ تبصرہ چھپی ہے کہ آٹھ عرب ملک (مصر، شام، سعودی عرب، کویت، بحرین، عمان، قطر، عرب امارات) ابھی سے نقشہ بنا رہے ہیں کہ پندرہ بلین ڈالر سے ایک فنڈ قائم کریں اور امریکہ سے کہیں کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی اس کی بحری اور فضائی فوجیں عرب کے آفاق کے اوپر (over the horizon) محسوس طور پر باقی رہیں تاکہ عرب ملکوں کے لئے بعد کو دوبارہ کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل کمزوری ان کی دسائیں سے خردی ہے۔ جب تک اس کمی کو دور نہ کیا جائے اسلام دشمنوں کی سازش اور دیسہ کاری کے خلاف احتجاج کا کوئی نائدہ نہیں۔ ایسی باتیں صرف جھجھلاہٹ کو بڑھاتی ہیں، وہ مسکو کو حل نہیں کرتیں۔



ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة (۷ فروری ۱۹۹۱ء) کے موضوع الغلاف کا عنوان تھا کہ خاتمہ قریب آگیا (الانتهاء تقترب) اسی طرح المجلة (۲۷ فروری) کی کوراسٹوری کا عنوان ہے: معركة تكوير الكونيت: الفصل الاخير۔ ٹائم جس پر ۲۵ فروری کی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ وہ حسب قاعدہ بیسی طور پر مجھے آج ملا۔ اس کی کوراسٹوری خلیج کی جنگ ہے اور اس کا عنوان بھی یہی ٹائم کیا گیا ہے کہ خاتمہ کا آغاز:

#### Beginning of the end

اتحادی طاقتوں کی رات دن کی مسلسل بمباری نے عراق کی دو تہائی فوجی طاقت برباد کر دی۔ عراق کے شہر اور اس کے بیشتر اہم مقامات کھنڈر ہو گئے۔ صدام حسین جو آخری فتح سے پہلے نہ رکنے کی باتیں کرتے تھے، وہ اب جنگ بندی کی پیشکش کر رہے ہیں۔ ہولناک جنگ کے ایک طرف خاتمہ کا آغاز شروع ہو چکا ہے۔ ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں عراق کی تباہی کی دردناک تصویریں ہیں۔ ایک تصویر میں ایک عراقی عورت اپنے تباہ شدہ مکان کے بلبر پر سر پکڑے ہوئے بیٹھی ہے۔ ایک تصویر میں مردہ عراقیوں کی لاشیں ٹرکوں میں لاد کر لے جانی جا رہی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک وسیع کھنڈر کے اوپر بیٹھی ہوئی دو عورتیں رو رہی ہیں۔ ایک اور بڑے کھنڈر کے اوپر ایک عراقی یالوسی اور نامرادی کی حالت میں دکھائی دے رہے۔ کسی تصویر میں پل ٹوٹے ہوئے ہیں کسی میں بڑی بڑی بلڈنگیں منہدم صورت میں نظر آرہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق کی یہ تباہی ۱۲۵۸ء میں تاناریوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی سے ہزاروں گنا زیادہ سخت ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ہندو فخر پرست بابری مسجد (اجودھیا) کی چہار دیواری توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور اس کے گنبدوں پر بھگوا جھنڈا لہرایا۔ ملک میں وسیع پیمانہ پر فسادات پھوٹ پڑے۔ اسی کے ساتھ خلیج میں دشمن اسلام امریکہ کی فوجیں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئیں۔ اب سارے ملک میں "قنوت ناز" پڑھی جانے لگی۔ مسلمان ہر طرف اللہم دمر دیا رہم کی بدعا کرنے لگے اور تمام اکابر و اصاغر نے اس پر آمین کہنا شروع کر دیا۔ یہ بد دعا تمام مسجدوں اور تمام اجتماعات میں جاری تھی۔ مگر، ۱ جنوری ۱۹۹۱ء کو جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو "تدمیر دیا"، کا عمل کافروں کے بجائے خود مسلمانوں کے اوپر ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان احتجاج غیر کا طریقہ چھوڑ دیں اور احتساب خویش کا طریقہ اختیار کریں۔



سعودی عرب کے شاہ فہد اور کویت کے امیر الصباح کی دعوت پر امریکہ اور دوسرے ۲۸ مغربی ملکوں کی فوجیں تقریباً پانچ لاکھ کی تعداد میں خلیج کے علاقہ میں جمع ہیں اور عراقی صدر صدام حسین کے خلاف تباہ کن جنگ میں مصروف ہیں۔ صدام نواز مسلمان ساری دنیا میں اس پر سخت اعتراض کر رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلم اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں نظر آتی ہیں: اسلام عیسائیت کی جو کھٹ پر۔ عرب حکمرانوں نے کافروں کو سرزمین حرم میں داخل کر دیا، وغیرہ۔

سعودی حلقہ اس بارہ میں مختلف نقطہ نظر رکھتا ہے۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة (۳۱ جنوری) میں اس سلسلہ میں الشیخ ابن باز کا فتویٰ چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مسلم حکمرانوں کے لئے اس میں کوئی شرعی نقصان نہیں کہ وہ غیر اسلامی حکومتوں سے مدد لیں جب کہ انھیں ایسی مدد کی ضرورت ہو (صفحہ ۷-۸) الدعوة (۲۱ فروری) میں دوبارہ الشیخ ابن باز کا مفصل مضمون چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں سے مدد لینا جائز ہے جب کہ ظالم دشمن کو ہٹانے اور اس کو ہلاک کرنے اور بلا اسلامی کو اس کے شر سے بچانے کے لئے ضروری ہو، خواہ وہ غیر مسلم۔ یہودی ہو یا عیسائی یا بت پرست۔ (سوارکان المستعان بہ یہودیا و نصرائیا، او دنیا، صفحہ ۲۱)

اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب، مطعم بن عدی، عبد اللہ بن ابی قحطہ وغیرہ سے مدد لی اور یہ سب غیر مسلم تھے۔ الشیخ ابن باز نے جو دلیل دی ہے یہی دلیل ہندستان کے علماء نے ۱۹۴۷ء کے پہلے دی تھی جب کہ انھوں نے تحریک حریت میں غیر مسلموں کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے تعاون لیا تو اس کا نتیجہ اسلام کے غلبہ کی صورت میں نکلا۔ جب کہ علماء ہند کے تعاون کا نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ اسی طرح یقینی ہے کہ خلیج کی جنگ کا سب سے بڑا فائدہ اسرائیل اور مغربی طاقتوں کو پہنچے گا اور سب سے بڑا نقصان عراق کو اور پھر مختلف انداز میں ساری مسلم دنیا کو۔

مذکورہ کے لئے مفید ہوگی، اس کا انحصار اس پر ہے کہ مدد لینے سے پہلے کس نے اپنی بنیاد بنائی ہے۔ ددرا دل کے مسلمان خود اپنی مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس لئے مدد کا فائدہ ان کے حصہ میں آیا۔ موجودہ مسلمانوں کی اپنی کوئی بنیاد نہیں، اس لئے مدد کا فائدہ بھی ان کو نہیں ملتا۔

۲۲ فروری ۱۹۹۱

امریکی زیر قیادت اتحادی فوجوں نے ۱۷ جنوری کو عراق پر بمباری کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب وہ عراق کی فوجی اور اقتصادی طاقت کو تقریباً توڑ چکے ہیں۔ اندازہ کے مطابق جلد ہی وہ زمینی حملہ شروع کر دیں گے جو یقینی طور پر چند دن سے زیادہ نہیں رہے گا۔ عراق کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ ہوگی کہ وہ ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈال دے (اتحادی فوجوں نے ۲۴ فروری ۱۹۹۱ء کو زبردست زمینی حملہ کر کے عراقی فوجوں کا قتل عام شروع کر دیا)

ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مقیم عراقی سفیر نے کہا ہے کہ خلیج کی جنگ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سوویت روس اب سپر پاور نہیں رہا۔ وہ بڑی طاقت کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ روس اس جنگ میں امریکہ سے یا اقوام متحدہ سے ہمارے موافق کوئی تجویز منوانے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے عراق روس کو اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتا تھا، مگر روس عراق کے کچھ کام آتا ہوا نظر نہیں آتا۔ لیکن عراقی سفیر کو روس کے دیوالیہ پن کے بجائے خود عراقی لیڈروں کے دیوالیہ پن کا شکوہ کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ روس اور امریکہ نے جون ۱۹۹۰ میں باقاعدہ طور پر سرد جنگ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا تھا۔ عراقی لیڈروں نے اس اعلان کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اس کے بعد انھوں نے اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ عراقی لیڈروں کی کارروائیاں بتاتی ہیں کہ وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ اس جنگ میں روس ان کی طرف سے کوڈ پڑے گا جس طرح سرد جنگ کے زمانہ میں روس اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف کوڈ پڑتے تھے۔ مگر روس کسی بھی درجہ میں عراق کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرد جنگ کا خاتمہ دونوں قوموں کے لئے برابری کا معاشرہ تھا۔ وہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ روس نے امریکہ کے مقابل میں سپر پاور کی حیثیت کھودی ہے۔ مگر عراقی اپنی خوش فہمی کی بنا پر اس کو سمجھ نہ سکے۔

عراقی لیڈر کہہ رہے ہیں کہ اصل جنگ تو زمینی جنگ ہے۔ زمینی جنگ شروع ہوگی تو ہم یہاں کے صحرا کو امریکیوں کا قبرستان بنادیں گے۔ مگر یہ محض بے خبری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں جنگ کا فیصلہ فضا میں ہوتا ہے اور فضا کی جنگ امریکہ جیت چکا ہے۔ اب زمینی جنگ صرف اختتامی کارروائی کے ہم معنی ہوگی نہ کہ نئی جنگ شروع کرنے کے ہم معنی۔ خوش فہمی کے گنبد میں رہنا آسان ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ حقائق کا بے رحم ہاتھ جب اس کو توڑتا ہے تو گنبد تو درکنار آدمی کے قدموں کے پیچھے کی اینٹ بھی نہیں ہوتی جہاں وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔

صدام حسین ۱۴ جنوری سے پہلے، اور پھر جنگ شروع ہونے کے ابتدائی دنوں میں بڑی بڑی باتیں کرتے تھے۔ مگر امریکہ کی زیر قیادت اتحادی طاقتوں (allied forces) نے مسلسل بمباری سے عراق کی فوجی طاقت توڑ دی۔ پہلے وہ کسی بھی حال میں کویت سے اپنا قبضہ ہٹانے پر راضی نہیں تھے۔ وہ اعلان کر چکے تھے کہ کویت اب ہمیشہ کے لئے عراق کا ۱۹ واں صوبہ بن چکا ہے۔ مگر اب وہ بلا شرط کویت سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامندی کا اعلان کر رہے ہیں۔ آج اخبارات کے صفحہ اول کی پہلی خبر ان کا یہی اعلان ہے جو انھوں نے سوویت روس کے واسطے کیا ہے۔ ہندوستان ٹائمز (۲۳ فروری) کے پہلے صفحے کی جلی سرخی یہ ہے کہ عراق غیر مشروط واپسی پر رضامند:

Iraq agrees to unconditional pull-out.

مگر اسی کے ساتھ دوسری سرخی یہ ہے کہ امریکہ نے قیام امن کی عراقی پیش کش کو رد کر دیا ہے۔ (US rejects peace offer) ۱۴ جنوری سے پہلے جیب کر جنگ شروع نہیں ہوئی تھی، امریکہ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ عراق اپنی فوجوں کو کویت سے واپس بلا لے۔ شاہ فہد نے اعلان کیا تھا کہ اگر صدام حسین کویت کو خالی کر دیں تو ان سے دوبارہ برادرانہ سلوک کیا جائے گا اور ان کی ہر طرح مدد کی جائے گی۔ مگر اس وقت صدام حسین نے بے نیازانہ طور پر اس کو رد کر دیا۔ اب باری امریکہ اور اس کے حلیفوں کی ہے۔ اب جبکہ عملاً وہ جنگ جیت چکے ہیں، اب وہ صدام حسین کو کھیلنے سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے نہیں۔ صدام حسین کا موجودہ جھکاؤ صرف ان کی نادانی کو ظاہر کرتا ہے۔ دانش مند آدمی جو کچھ کرتا ہے وہی بیوقوف آدمی بھی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دانش مند آدمی تباہی سے پہلے کرتا ہے اور بیوقوف آدمی تباہی دیکھنے کے بعد۔ اسی لئے فارسی شاعر نے کہا ہے کہ آدمی ایسا اقدام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو: جبر اکارے کند عاقل کہ باز آید پشیمان

اقدام وہ ہے جو کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچے۔ جو اقدام صرف بربادی پر ختم ہو وہ خود کشی کی جھلانگ ہے نہ کہ کوئی واقعی اقدام۔ بد قسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما تقریباً سب کے سب اسی قسم کے جھوٹے اقدام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ ان کے غیر حقیقت پسندانہ اقدامات نے مسلمانوں کو کچھ فائدہ تو نہیں پہنچایا۔ البتہ ان کی بربادی میں مزید اضافہ کر دیا۔



ٹائم میگزین (۳ فروری) میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں کچھ لوگ ہیں جو خلیج کی جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔ افریقی امریکن (سیاہ فام) جو سفید فام نسل سے نفرت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سفید فام لوگوں کی برتری قائم کرنے کی جنگ ہے۔ اس لئے ہم کو اس میں شریک نہیں کیے جانا چاہئے (صفحہ ۳۹)۔ یہی معاملہ امریکی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے نزدیک امریکہ ایک اسلام دشمن ملک ہے۔ وہ موجودہ جنگ کو کافر اور مسلم کی جنگ سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی جنگ میں شرکت کے خلاف ہیں (ٹائمز آف انڈیا ۱۳ فروری، صفحہ ۶)۔

ٹائم (۲۵ فروری) میں کوریا کے ایک شہری ڈیوڈ اسکاٹ (David E. Scott) کا خط اس کے جواب میں چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکی شہریت اختیار کرنے کے بعد کسی شخص کے لئے ایسا کہنا درست نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک لڑکا امریکی ہے۔ یہ واقعہ کہ وہ کوریا میں پیدا ہوا تھا، اس سے اس کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی کہ وہ اس ملک کا دفاع کرے۔ اگر آپ فائدوں کو قبول کریں تو آپ کو ذمہ داریوں کو بھی قبول کرنا ہوگا۔

My son is an American. The fact that he was born Korean does not in any way diminish his responsibility to defend this country. If you accept the benefits you must also accept the responsibilities (p. 8)

میں سمجھتا ہوں کہ کوریا کے مراسلہ نگار نے جو بات کہی ہے وہ عین درست ہے۔ جب آپ ایک ملک کے شہری بنیں اور اس کی مطلق وفاداری اور اس کے دفاع کا عہد کریں تو آپ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ خارجی وفاداریوں کو ترک کر کے صرف اس کے وفادار بنیں اور بوقت ضرورت اس کی طرف سے لڑیں۔ کسی شخص کو یہ حق تو ہے کہ وہ ایسے ملک سے اپنی شہریت کو ختم کر دے اور وہاں سے ہجرت کر جائے مگر شہری رہتے ہوئے ایسا کرنا درست نہیں۔

یہ نہایت سطحیت اور گراؤٹ کی بات ہے کہ آدمی فائدہ کو تو لے لے، مگر وہ ذمہ داریوں کو لینے کے لئے تیار نہ ہو۔ ذمہ داریوں کو اٹھانا ہی وہ قیمت ہے جس سے فائدوں کو لینے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ذمہ داریوں کو اٹھانے سے انکار کرے تو فائدوں کو لینے کے لئے بھی اس کا استحقاق ختم ہو جائے گا۔

۲۵ فروری ۱۹۹۱

ریڈرس ڈائجسٹ (فروری ۱۹۹۱) نے چھ صفحہ کی ایک رپورٹ چھاپی ہے اس کے لکھنے والے سٹر فلک (Rachel Flick) ہیں۔ اس میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ مغرب نے کس طرح صدام حسین کو بیوقوف بنا کر عراق کی دولت کو لوٹا۔ عراق کا تیل اور اس کی ۵۴ بلین ڈالر کی سالانہ آمدنی کا بیشتر حصہ مغربی ملکوں کو پہنچتا رہا۔ پچھلے ۲۰ سال سے عراق بیرونی فوجی ہتھیاروں کی خریداری پر ۱۴ ہزار بلین ڈالر سالانہ خرچ کرتا رہا ہے۔ مغربی ٹھیکہ داروں کے ذریعہ صدام حسین نے اپنی ایر فورس کے لئے بے شمار نہایت مہنگے انڈر گراؤنڈ بیس تیار کرائے۔ وغیرہ

صدام حسین کو عرب لیڈر بننے کا جنون تھا۔ اس جنون کو مغرب نے استعمال کیا۔ اس نے عراق سے سستا تیل خریدا اور اس کو نہایت مہنگے ہتھیار فروخت کئے۔ اس طرح یہ خود مغرب ہے جس نے صدام حسین کو اپنے تجارتی اغراض کے لئے مسلح کیا۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا۔ مغرب یہ سمجھتا تھا کہ عراق اپنی فوجی طاقت کو ایران کے خلاف استعمال کرے گا، وہ اس کے دشمن کے خلاف ہتھیار ثابت ہوگا۔ مگر صدام حسین کو اپنے ڈکٹیٹر مزاج کی وجہ سے حقائق کی بالکل خبر نہ تھی۔ انھوں نے ایران پر حملہ اور کویت پر حملہ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ ایران پر حملہ مغرب کو عین مطلوب تھا مگر کویت پر حملہ مغرب کے لئے عین غیر مطلوب تھا، کویت پر حملہ کر کے صدام حسین نے خود مغرب کے مفاد پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ سارے مغرب نے متحدہ طور پر ملے کیا کہ صدام حسین کو کچل دیا جائے۔

مذکورہ مضمون میں لندن کے پروفیسر کوپیتز (Hans-Heino Kopietz) کا تبصرہ نقل کیا گیا ہے انھوں نے کہا کہ ہم نے (مغربی حکومتوں نے) اس معاملہ میں اپنی آنکھیں بند کر لیں اس لئے کہ اس سے ہم کو تجارتی فائدہ تھا۔ اور اس لئے کہ صدام ایران کے خلاف ہمارے لئے ایک مفید حربہ تھے۔ صدام ایک ایسا عنقریب ہے جس کو خود مغرب نے پیدا کیا:

We closed our eyes because some business wanted to make money and because Saddam was a useful tool against Iran. Saddam is a Frankenstein monster that the West created. (150)

صدام اگر قومی تعمیر کا منصوبہ بناتے۔ وہ مغرب کے ذریعہ اپنی زراعت اور صنعت کو ترقی دیتے۔ وہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بناتے تو عراق کا مستقبل اس سے مختلف ہوتا جو آج وہاں دکھائی دے رہا ہے۔

قومی آواز (۲۶ فروری) میں خلیج کی جنگ کے بعد اثرات کے بارے میں ایک جائزہ شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے: 'نئی دہلی کے ایک سعودی ڈپلومیٹ نے اس نامہ نگار سے گفتگو کے دوران عالمی مسلم رائے عامہ میں تبدیلی پر انتہائی برسنگل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جنگ کے خاتمہ پر سعودی عرب دنیا کی مختلف سرکردہ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے گا کیوں کہ یہ تمام جماعتیں اور تنظیمیں سعودی موقف کے حق میں عوامی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں (صفحہ ۷)'

سعودی عرب نے تمام دنیا کی مسلم جماعتوں کو غیر معمولی مالی امداد دی۔ مگر خلیج کے بحران کے زمانہ میں تقریباً ہر ملک کے مسلم عوام سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کے حامی بن گئے۔ حالانکہ اس معاملہ میں سعودی عرب کی حیثیت دفاع کرنے والے کی تھی اور صدام حسین کی حیثیت جارح اور ظالم کی۔ اس کی وجہ مسلم رہنماؤں کی جذباتی سیاست ہے۔ ان رہنماؤں کا مفاد اس میں تھا کہ وہ عوام کی بھیڑ جمع کریں تاکہ عرب ملکوں کی نظر میں ان کی یہ حیثیت قائم ہو کہ مسلم عوام ان کے ساتھ ہیں۔ مسلم رہنماؤں کا یہ قیادتی تقاضا انھیں اس طرف لے گیا کہ وہ جذباتی نفروں کا استعمال کریں۔ کیوں کہ عوام کی بھیڑ صرف جذباتی نفروں پر ہی جمع کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فلسطین کے اشوکو خوب بڑھا چڑھا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ زبان و قلم کی ساری طاقت یہ ثابت کرنے پر لگادی کہ امریکہ سب سے بڑا اسلام دشمن ہے۔

اس طرح مسلمانوں کے جذبات اسرائیل کے بارے میں اور امریکہ کے بارے میں شدت کے ساتھ بھڑک اٹھے۔ وہ اس معاملہ میں آخری حد تک حساس ہو گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صدام حسین سب سے بڑے دشمن اسلام (امریکہ) کو چیلنج کر رہا ہے۔ وہ ظالم اسرائیل پر اسکاٹھ میزائل مار رہا ہے۔ اور اسرائیل کے سربراہوں سے کہہ رہا ہے کہ ہوش میں آجاؤ۔ کیوں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ زندہ ہو گیا۔۔۔ صدام حسین کے یہ الفاظ مسلمانوں کی موجودہ نفسیات کے اعتبار سے بالکل جادو ثابت ہوئے۔ انھیں دکھائی دیا کہ سعودی عرب اسلام کے دشمن نمبر ایک کا ساتھ دے رہا ہے اور صدام حسین اسلام کے دشمن نمبر ایک کو سمند میں غرق کرنے کا نعرہ لگا رہا ہے، تو وہ اپنی مذکورہ نفسیات کی بنا پر سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کی طرف دوڑ پڑے۔ کسی مسئلہ پر قوم کو غیر مناسب حد تک حساس بنانا شخصی قیادت کے لئے بہت کاآمد ہے۔ مگر خود قوم کے لئے وہ تباہ کن حد تک غیر مفید ہے۔



المجلد (۲۷ فروری ۱۹۹۱) میں دکتور علی الدین ہلال (مدیر مرکز الدراسات الیاسیہ بحیثیۃ القاہرہ) کا مضمون چھپا ہے۔ یہ غلطی بحران کے اسباب کے بارہ میں ہے۔ اس کا عنوان ہے: فلنندبر الاسباب ونحن فی قلب العاصفة۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم معاملات کو محض ان کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور جڑ کی اور گہرائی کی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس عقل سے مسلح کریں جو ہم کو اس قابل بنائے کہ ہم غلطی اور اس کی قوموں کے مسائل کا مقابلہ زیادہ گہرے انداز میں کر سکیں (اننا نأخذ الأمور عادة بمظاهرها ولا نبحت فی الجذور والأعماق..... والمطلوب منا جميعا ان نسلح بالعقل الذی يمكننا من مواجهة مشاغل المنطقة وشعوبها بشكل جوهري وجذري (صفحہ ۲۳)

اصولاً یہ بات نہایت اہم ہے۔ مگر موجودہ شکل میں وہ بالکل بے فائدہ ہے۔ قوم کے اندر مطلوبہ عقل پیدا کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ تنقید کی کھلی آزادی ہو۔ تنقید سے میری مراد المجلد کے مذکورہ مضمون جیسی عمومی تنقید نہیں بلکہ متعین اور مشخص تنقید ہے۔ اور موجودہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز یہی تنقید ہے۔ جب تک متعین اور مشخص تنقید کے بارہ میں مسلمانوں کی غیر ضروری حساسیت کو ختم نہ کیا جائے ان کے اندر عقلی بالیدگی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

مثال کے طور پر خلیج کے معاملہ کو لیجئے۔ اس کی جڑ یہ ہے کہ آج پوری مسلم دنیا میں یہ مزاج بن گیا ہے کہ ظالمانہ کارروائی کی زد غیر پر پڑے تو اس کی مذمت نہیں کی جاتی۔ کسی ظالمانہ کارروائی کی مذمت صرف اس وقت کی جاتی ہے جب کہ اس کی زد خود اپنے آپ پر پڑ رہی ہو۔ صدام حسین نے ۷ اکتوبر ۱۹۸۰ کو ایران پر بمباری کی تو عرب حلقہ نے اس کی مذمت نہیں کی۔ اسی صدام نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت پر حملہ کیا تو پورا عرب حلقہ بیچ اٹھا۔ یہ مزاج برائی کی جڑ ہے۔ لیکن اگر اس برائی کی کھلی نشاندہی کی جائے تو مقدس ترین لوگ بھی اس کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

اس مزاج کو باقی رکھتے ہوئے تسلیح بالعقل کی بات کرنا محض ایک خوش خیالی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

۲۸ فروری ۱۹۹۱

ٹائم میگزین کا شمارہ جس میں ۳ مارچ ۱۹۹۱ کی تاریخ چھپی ہوئی ہے، وہ پیشگی طور پر مجھے آج ملا۔ اس شمارہ میں حکومت روس کے ایڈوائزر پرائیماکوف (Yevgeni Primakov) کی ایک تازہ تحریر شائع ہوئی ہے جو صدام حسین اور خلیج کے مسئلے سے متعلق ہے۔

مسٹر پرائیماکوف لکھتے ہیں کہ میں صدام حسین سے بار بار ملا ہوں۔ سب سے پہلے صدام حسین سے میری ملاقات ۱۹۶۹ میں ہوئی جب کہ میں پرادو اکا کر سپانڈنٹ تھا۔ اس وقت صدام حسین بعث پارٹی کے لیڈر تھے، مگر ابھی وہ عراق کے صدر نہیں بنے تھے۔ صدام حسین کے صدر بننے کے بعد ان سے میری بار بار ملاقاتیں ہوئیں، بغداد میں بھی اور ماسکو میں بھی۔ حتیٰ کہ میرے اور ان کے درمیان بے تکلفانہ تعلقات ہو گئے، فروری ۱۹۹۱ میں وہ میخائیل گورباچوف کے نمائندہ کی حیثیت سے کئی بار صدام حسین سے ملے اور عراقی صدر کو کویت سے اپنی فوجیں واپس کرنے کے معاملے میں بات کی۔

مسٹر پرائیماکوف کہتے ہیں کہ صدام حسین سے قریبی تعلق کے بعد میں نے جانا کہ صدام حسین کو پوری بات سے واقفیت نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے موافق رپورٹوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، مثال کے طور پر، عرب دنیا میں عراق کی حمایت کے بارہ میں، مغرب میں جنگ کے مخالف مظاہروں کے بارہ میں، عراق کے خلاف اتحادی ملکوں میں اندرونی اختلاف کے بارہ میں۔ اور جہاں تک بری خبروں کا تعلق ہے تو ایسی خبر لانے والے کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

I realized that it was possible Saddam did not have complete information. He gave priority to positive reports: for example, about the support Iraq was receiving in the Arab World, about the antiwar demonstrations in the West, about the first hints of differences between the allies in the anti-Iraqi coalition. And as for bad news, the bearer could pay a high price.

یہی کمزوری تمام مسلم رہنماؤں میں پائی جاتی ہے، حتیٰ کہ مسلمانوں کے مقدس بکاہر میں بھی۔ یہ لوگ اپنے فرضی تخیلات میں گم رہتے ہیں۔ ان کو ایسے ہی افراد پسند آتے ہیں جو ان کے مفروضات کی تصدیق کریں۔ جو شخص ان سے اختلافی بات کرے وہ ان کی نظر میں فوراً مبغوض ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حقیقت حال سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ وہ ایسے غیر پختہ اقدامات کرتے ہیں جن کا نتیجہ بربادی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہ ہو۔

یکم مارچ ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ احمقاء اقدام پر شروع ہوئی اور آخر کار بدترین شکست پر ختم ہو گئی۔ آج کے اخبارات عبرتناک خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ٹائٹس آف انڈیا (یکم مارچ) نے نہایت جلی حروف میں اپنے پہلے صفحہ پر یہ سرخی قائم کی ہے کہ خلیج کی جنگ ختم (Gulf war ends) اس کے ساتھ سات کالمی تصویر ہے جس میں عراق کے جنگی قیدی بڑی تعداد میں ٹرکوں میں بھرے ہوئے ہیں اور امریکی سپاہی ان کو مخصوص کیمپوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ تصویر اس بات کا اعلان ہے کہ یہ شکست بھی کتنی اور اسی کے ساتھ ذلت اور رسوائی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ”رسوا کن شکست“ کا اتنا بڑا واقعہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو ۵۸۶ ق م میں بنی اسرائیل کے اوپر ہوا کہ نصیر (Nebuchadrezzar II) کے ہاتھوں گزرا تھا۔ اس کا ذکر قرآن (بنی اسرائیل ۵) میں مختصر طور پر اور بائبل میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس سلسلہ میں بائبل کی کتاب یرمیاہ کا مطالعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کے طاقتور جہازوں نے رات دن بمباری کر کے عراق کی اقتصادیات کو تباہ کر دیا۔ عراق کی زمین کے نیچے دینا کے تیل کے ذخیرہ کا دس فی صد موجود ہے۔ تیل کے ذریعہ اس کی آمدنی ۴۵ بلین ڈالر سالانہ تھی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ عراق کے شہروں میں لوگ مڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی چیزیں جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تاکہ اس سے اپنے چولہے کو جلائیں۔ عراق کو تباہ کرنے کے بعد اتحادی فوجوں نے عراق اور کویت کے درمیان پہلائی لائن کاٹ دی۔ کویت میں مقیم عسکری فوج بالکل بے سہارا ہو گئی اور صرف دودن کی زمینی کارروائی میں ہتھیار ڈال کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ ۳۰ ہزار قیدی بنائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روایتی ہتھیاروں اور ”ہائی ٹیک“ کے درمیان مقابلہ تھا جس میں روایتی ہتھیاروں کو لازماً شکست کھانا تھا۔

جنگ میں تمام دنیا کے مسلمان صدام کے حامی بن گئے تھے۔ اس اعتبار سے صدام کی شکست ساری دنیا کے مسلمانوں کی شکست ہے۔ عراقی لیڈروں نے اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس نادانی کے ذریعہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں رسوا کر لیا ہے۔ اس واقعہ پر یہ حدیث صادق آتی ہے کہ: کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے کو کیوں کر ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسے فتنہ کا سامنا کرے جس سے بچنے کی طاقت اس کے اندر نہ ہو (مشکاۃ المصابیح ۲/۱۷۱)۔



## روشن امکانات

آئر لائنڈ کے ایک شہر (Athlone) سے ایک ماہانہ انگریزی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام مسلم ویوز (Muslim Views) ہے۔ اس کے شمارہ مارچ ۱۹۹۱ میں ایک نو مسلم مسٹر شفیق مارٹن (Shafiq Morton) کا مضمون خلیج کی جنگ کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے امریکی صدر جارج بش کی حکومت کے اس نظریہ کا ذکر کیا ہے کہ خلیج میں امریکہ کی کامیابی نے اس کے لئے علاقہ میں مواقع کی ایک کھڑکی کھول دی ہے:

The Bush administration believes its success in the Gulf has given it a window of opportunity in the area.

مسٹر شفیق مارٹن کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خلیج کی جنگ کے بعد مواقع کی جو کھڑکی کھلی ہے، اسے مسلمانوں کو استعمال کرنا چاہئے نہ کہ امریکہ کو:

Muslims not the US must use the window.

خلیج کی جنگ بلاشبہ ایک دردناک المیہ تھی۔ مگر اس دنیا میں ”زوحین“ کا تخلیقی اصول کارفرما ہے (الذاریات ۱۲۹)۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ اس کا ضد بھی ضرور موجود رہتا ہے۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اس دنیا کی کوئی بھی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں، خواہ وہ حیوانات کا معاملہ ہو یا جمادات اور نباتات کا۔ حتیٰ کہ معانی اور حقائق بھی اس دنیا میں ہمیشہ جوڑے کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔

عسکر کا جوڑا سر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ یہاں ہمیشہ عسکر (مشکل) کے ساتھ یسرا آسانی، بھی لازمًا موجود رہے۔ اس دنیا میں کسی کے لئے جب ایک دُش ایڈوانٹج پیدا ہوتا ہے وہ ایک ایڈوانٹج بھی اپنے ساتھ ضرور لے آئے۔ چنانچہ یہاں بھی نفی پہلو کے ساتھ مثبت پہلو موجود ہے۔

تعمیری پیسلو

خلیج کی جنگ شروع ہوئی تو ۱۸ جنوری ۱۹۹۱ کو عراق نے اسرائیل کے اوپر ایک اسکڈ (Scud) مارا جس کا نام صدام حسین نے حجازہ البسیل رکھا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے تقریباً ڈیڑھ مہینہ کے اندر ۳۵ اسکڈ اسرائیل کے مختلف نشانوں پر پھینکے۔

یہ صدام حسین کی نہایت گہری تدبیر تھی۔ صدام حسین کا خیال تھا کہ اسرائیل کی زمین پر عراقی اسکڈ گرتے ہی اسرائیل اپنے معروف مزاج کے مطابق پھراٹھے گا اور فوراً عراق کے اوپر جوابی حملہ کرے گا۔ اس طرح یہ جنگ عراق۔ امریکہ جنگ نہ رہے گی بلکہ عرب۔ اسرائیل جنگ بن جائے گی اور پھر تمام عرب اور تمام دنیا کے مسلمان عراق کے ساتھی بن جائیں گے۔

مگر جو شخص اپنے کو ہوشیار اور دشمن کو بے وقوف سمجھے، وہ خود سب سے بڑا بیوقوف ہے۔ چنانچہ اسرائیل نے امریکہ کے مشورہ پر اس معاملے میں جوابی حملہ کے بجائے جوابی ہوشیاری کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ طریقہ ضبط (restraint) تھا۔ وہ بار بار عراقی اسکڈ کا شکار ہوتا رہا۔ مگر اس نے نہ صرف یہ کہ کوئی جوابی کارروائی نہیں کی بلکہ عراقی حملہ اور اس کے نقصانات کے اعلان و اظہار سے بھی مکمل پرہیز کیا۔

ضبط کی اس پالیسی کا نتیجہ اسرائیل کو نہایت شاندار ملا۔ فلیج کی جنگ عرب۔ اسرائیل جنگ نہ بن سکی۔ نقصان کی تلافی کے نام پر عراق کے ہر اسکڈ پر اسرائیل کا ایک بین ڈالر کا بل بنتا رہا جس کو امریکہ نے بلاتاخیسرا سے ادا کر دیا۔ مزید یہ کہ امریکہ کی کامیاب فوجی کارروائی نے فلسطینی تحریک کو اس انجام تک پہنچا دیا جس کا اندیشہ ایک مبصر نے ان لفظوں میں ظاہر کیا تھا :

It seems that the Palestinian question will be one of the principal casualties of Desert Storm.

عراق کی طرف سے اسکڈ میزائل کے مسلسل حملے اسرائیل کے لئے انتہائی اشتعال انگیز تھے۔ مگر اسرائیل نے کسی بھی قسم کی کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ اس نے اس معاملہ کو چھپایا اور آخری حد تک ضبط و تحمل سے کام لیا۔ اسی کا نام حقیقت پسندانہ سیاست ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ سیاست موجودہ مسلمانوں میں معدومیت کے درجہ میں ختم ہو گئی تھی۔ فلیج کی جنگ میں ایک دشمن کے ذریعہ اس طریق عمل کا کامیاب مظاہرہ کر کے مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ اس طرح کے معاملات میں نتیجہ خیز عمل کا طریقہ کیا ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کو اپنی سیاست کس ڈھنگ پر چلانا چاہئے۔ فلیج کا یہ واقعہ اس معاملہ میں ایک چشم کشا واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

راقم الحروف کا اندازہ ہے کہ یہ جنگ مسلمانوں کے لئے ہمیز ثابت ہوئی ہے اور انھوں نے اس

سے نہایت گہرے طور پر حقیقت پسندی کا سبق لیا ہے۔ ان کے اندر واضح طور پر سیاست کا نیا انداز ابھرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ”دوست“ کی بات ان کی آنکھ کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی، مگر ”دشمن“ کے عمل نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اب یقینی ہے کہ بیسویں صدی کا خاتمہ مسلمانوں کی بے فائدہ جذباتی سیاست کا خاتمہ ثابت ہوگا۔ اکیسویں صدی میں وہ از سر نو ایک حقیقت پسند قوم بن کر داخل ہوں گے اور انشاء اللہ اسلام کی نئی تاریخ بنائیں گے۔

خلج کے تحریبی واقعہ میں یہ تعمیری پہلو واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے جذباتی انداز فکر پر روک لگائی ہے اور ان کے اندر حقیقت پسندانہ طرز فکر ابھارا ہے۔ وہ اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ بڑے بڑے الفاظ بول کر کوئی کام نہیں۔ اصل کام عمل ہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ وہ اس راز کو جان رہے ہیں کہ اقدام وہ ہے جو نیاری کے بعد کیا جائے۔ تیاری کے بغیر کیا ہوا اقدام خود کشی کی چھلانگ ہے نہ کہ کوئی حقیقی اقدام۔ وہ زندگی کی اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو گئے ہیں کہ طاقت دراصل داخلی استحکام کا نام ہے۔ کوئی بھی خارجی چیز داخلی کمزوری کی تلافی نہیں بن سکتی۔

اب تک مسلمان صرف بولنے کو کام سمجھے ہوئے تھے، اب انھوں نے جاننا کہ بہت سے مواقع پر نہ بولنا ہی زیادہ بڑا کام ہوتا ہے۔ وہ ہر عمل کے بعد جوابی عمل کرنے کو ضروری خیال کئے ہوئے تھے، اب انھوں نے یہ دریافت کیا کہ اکثر اوقات فریق ثانی کے عمل کے باوجود جوابی عمل نہ کرنا زیادہ موثر کارروائی ہوتا ہے۔ اب تک وہ اس وہم میں پڑے ہوئے تھے کہ جب کسی کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جائے تو اس کے بعد ہمارا مشتمل ہو جانا صین فطری ہے، مگر قطع کے تجربہ سے انھوں نے یہ سیکھا ہے کہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتمل نہ ہونا زیادہ کامیاب اقدام ہے۔

مسلمان اب تک اس غلط فہمی میں تھے کہ اگر طاقت ہو تو اس کو استعمال کرنا بھی ضروری ہے، اب انھوں نے جاننا کہ استعمال طاقت سے بھی زیادہ بڑی چیز مظاہرہ طاقت ہے۔ اب تک وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ ہر موقع پر لڑ جانے کا نام جہاد ہے۔ اب انھوں نے جاننا کہ سب سے پہلا جہاد قوم کو تیار کرنا ہے۔ ضروری تیاری کے بغیر قوم کو جگمگایا جانا جہاد نہیں ہے بلکہ فساد ہے جس کا کوئی نتیجہ اسباب کی اس دنیا میں نکلنے والا نہیں۔



## دعوتی پہلو

دوسرا زیادہ اہم اور دور رس فائدہ وہ ہے جو دعوتی مواقع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مغربی لوگوں کا تعلق اہل اسلام سے بہت جیسے پیانے پر قائم ہوا۔ پانچ لاکھ سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ امریکہ اور یورپ سے نکلی کر فلپج میں اکٹھا ہو گئے۔ ان کا ساتھ مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے ذریعہ دعوت اسلامی کے نئے مواقع کھلے۔

آسٹریا کے نو مسلم یو پو لڈ اسد ۱۹۲۲ میں اخباری کر سپانڈنٹ کی حیثیت سے مسلم مشرقی ملکوں میں گئے۔ وہاں وہ اتنا متاثر ہوئے کہ کچھ دنوں بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنی کتاب ر وڈ ٹو مکہ میں لکھا ہے کہ جس چیز نے مجھے سب سے پہلے سوچنے پر مجبور کیا، وہ مغربی قوموں اور مسلمانوں کے طریق زندگی کا فرق (difference) تھا۔ یہاں سے ان کے فکر کا آغاز ہوا جو بعد کو اسلام کے مطالعہ میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

بہی و اٹم خلیج میں امریکہ اور یورپ کی فوجوں کی آمد کا ہوا ہے۔ انھوں نے یہاں اپنے ملک کی زندگی اور مسلمانوں کی زندگی میں جو ”فرق“ دیکھا، اس نے انھیں غور و فکر کرنے پر مجبور کیا۔ بہت سے لوگ اسلام سے متاثر ہوئے اور ان کی ایک تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ سعودی اخبارات کی اطلاع کے مطابق، دسمبر ۱۹۹۰ کے آخر تک خلیج میں آنے والے تقریباً ڈیڑھ سو امریکیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (قومی آواز ۷ جنوری ۱۹۹۱)۔

مختلف اطلاعات بتاتی ہیں کہ سال میں امریکہ میں اسلام کے مطالعہ کا رجحان کافی بڑھا ہے۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے بتایا کہ وہ مشکاگو گئے۔ وہاں کتابوں کی ایک بڑی دکان میں چلنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے دکان والوں سے پوچھا کہ آپ کے یہاں سلمان رشیدی کی کتاب ”دی سٹینک درسز“ کی فروخت کیسی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج اس کی تین کتاب فروخت ہوئی ہے۔ پھر انھوں نے دکان دار سے پوچھا کہ آج قرآن کا ترجمہ کتنا فروخت ہوا۔ دکان دار نے بتایا کہ آج کی تاریخ میں صرف چار سے یہاں سے انگریزی ترجمہ قرآن کے ۵ نسخے فروخت ہوئے ہیں۔

بہی حال یورپ کا بھی ہے۔ موجودہ حالات نے اسلام کو اور مسلمانوں کو اخبار اور ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں میں نمایاں کیا۔ ہر طرف مسلم معاملات کا چرچا ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام

کے بارہ میں واقفیت حاصل کرنے کے رجحان میں بھی تیزی سے اضافہ ہو گیا۔ مثال کے طور پر راقم الحروف کے پاس مغربی جرمنی سے ایک خط آیا ہے۔ مکتوب نگار مسز عزالہ جنگ نے لکھا ہے کہ آجکل یورپ میں اسلام کے مطالعہ میں دلچسپی بہت بڑھی ہے۔ اور "گاڈ رائزر" اور "معدی پرافٹ آف ریولوشن" کی جو کاپیاں میرے پاس ہیں، ان کی مانگ میں بہت اضافہ ہو گیا ہے:

"These days there is so much interest in Islam and my copies of *God Arises and Muhammad the Prophet of Revolution* are in great demand."

مغرب کے فوجیوں کے درمیان اسلام کے بارہ میں جو تحس پیدا ہوا، اسی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ خود امریکی حکومت نے اس کا اہتمام کیا کہ وہ اسلام کے بارہ میں بنیادی معلومات مرتب کر کے اپنے فوجیوں تک پہنچائے۔

نومبر - دسمبر ۱۹۹۰ میں ایک سفر کے تحت امریکہ میں تھا۔ ۴ دسمبر کا واقعہ ہے میں لاس اینجلس کے اسلامک سنٹر میں تھا۔ اس دوران کچھ سفید فام امریکی مرکز میں آئے۔ معلوم ہوا کہ یہ امریکی فوج کے ریڈیو اینڈ ٹیلی وزن براد کا سنٹرک سنٹر کے افراد ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈاکٹر کٹر اسلامک سوسائٹی آف نیج کا دفنی) سے ملاقات کی۔ اور ویڈیو کیسٹ تیار کرنے کے لیے پروگرام کے بارہ میں ان سے گفتگو کی۔

معلوم ہوا کہ امریکی فوج کے منصوبہ کے تحت ایک ویڈیو فلم تیار کی جا رہی ہے۔ اس کا عنوان ہو گا "اسلام کیا ہے"۔ اس میں کسی کمی یا اضافہ کے بغیر اسلام کا تعارف کرایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کا انتخاب کیا ہے جو باقاعده عالم اور پختہ مسلمان ہیں۔

امریکی مسئلہ کے ایک ممبر نے گفتگو کے دوران کہا کہ خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی سے ایک اچھی چیز برآمد ہوئی ہے کہ بہت سے امریکی اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں:

"The one good thing that came out of this armed forces presence in the Gulf is that many people are now interested to know more about Islam and Muslim people."

اسلام کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی دوسری قوموں کا اختلاط مسلمانوں سے پیش آیا ہے

وہ مسلمانوں سے اور اسلام سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ خواہ وہ بظاہر دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی ایک واضح مثال تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کا مسلمانوں سے اختلاط کا واقعہ ہے۔ تاتاری اگرچہ جارح اور دشمن تھے، مگر جب ان کا مسلمانوں سے قریبی اختلاط ہوا تو اسلام نے انہیں مسخر کر لیا اور ان کی بڑی تعداد اسلام کے ملکہ میں داخل ہو گئی۔ اسلام کے دشمن اسلام کے دوست بن گئے۔

امریکیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ کلمے ذہن کے ہوتے ہیں۔ کوئی بات ان سے کہی جائے تو عام طور پر وہ اس کو غور سے سنتے ہیں اور غیر متعصبانہ ذہن کے تحت اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات میں نے پڑھے ہیں۔ نیکلی واقعات خود میرے ذاتی علم میں آئے ہیں۔

ایک واقعہ وہ ہے جو ۵ دسمبر ۱۹۹۱ء کی شام کو امریکہ میں قیام کے دوران پیش آیا۔ اس روز اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی (کیل فورنیا) کے ہال میں ایک اجتماع تھا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ یہ یہودی، مسیحی، مسلم سینار (Trialogue) تھا۔ سینار کی تشکیل پر خاتمہ کا کلمہ مجھے کہنا تھا۔ تینوں مذہب کے تین بنیادی مقرر حسب ذیل تھے :

1. Rabbi Dr David Gordis,  
President, University of Judaism, L.A.
2. Rev. Dr George Grose,  
President, Academy for Judaic, Christian & Islamic  
Studies, L.B.
3. Imam Dr Muzzammil H. Siddiqi,  
Director, Islamic Society of Orange County, C.A.

پہلے یہودی عالم نے تقریر کی اور اپنے مذہب کی تعلیمات کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد عیسائی عالم کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے مذہب کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ آخر میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائریکٹر اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی) کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اسلام کا تعارف پیش کیا۔

ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کی تقریر اسی طرح بقیہ دونوں تقریروں پر بھاری ہو گئی جس طرح اسلام دوسرے مذاہب پر بھاری ہے۔ میرے قریب کی سیٹوں پر چند امریکی نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تعابلی مذہب (comparative religion) کے طلبہ تھے۔ وہ اگر یہ کہہ سکتے تھے اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر کو سننے کے بعد ایک نوجوان نے اپنے امریکی ساتھیوں سے کہا کہ میں



مسیحی ہوں۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر نے مجھے اپنے عقیدہ کے بارے میں شک میں ڈال دیا ہے اور میں دوبارہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مجھے اسلام کے بارے میں اور زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ وہ واقعہ غیر معمولی قسم کے لائق آدمی ہیں:

I am a Christian. But Dr Siddiqi's presentation makes me think twice. I have to learn more about Islam. He was terrific real genius.

حل یہاں ہے

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ اسرائیل ہے۔ ۱۹۴۸ء کے جہاد فلسطین سے لے کر ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج تک سیکڑوں چھوٹے بڑے فوجی اور اس مسئلہ کے نام پر ہو چکے ہیں۔ مگر ۵۰ سالہ کوششوں کے باوجود اصل مسئلہ ایک فیصد بھی حل نہ ہو سکا۔ بلکہ دن بدن اس میں افسانہ ہوتا جا چکا ہے۔

اس معاملہ میں جہاد و قتال کا طریقہ بہت زیادہ آزمایا جا چکا ہے۔ اب میں کہوں گا کہ مسلمان اس معاملہ کو حل کرنے کے لئے وہ طریقہ اختیار کریں جس کو دعوت کا طریقہ کہا جاتا ہے۔

یہاں میں ایک حدیث یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کئی دور کے آخر میں جب کہ اسلام کے لئے بظاہر نہایت مشکل حالات ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امرت بقریۃ متاعل القریۃ یقولون یشرب وہی المدینۃ (مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بستی تمام دوسری بستیوں کو کھاکھا جائے گی۔ لوگ اس کو یشرب کہتے ہیں، اور وہ مدینہ ہے)

یہ کمرے ہجرت کر کے مدینہ جانے کی طرف اشارہ تھا۔ مگر ہجرت محض ترک وطن کا نام نہیں ہے۔ ہجرت دراصل تبدیلی عمل کا نام ہے۔ یعنی مشن کو آگے بڑھانے کے لئے جب ایک مقام پر عمل کرنا مؤثر نہ ہو رہا ہو تو دوسرے مقام پر عمل شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق مکہ کو چھوڑ دیا، اور مدینہ کو اپنا مرکز عمل بنایا۔ جیسا کہ معلوم ہے، اس کے جلد ہی بعد وہ حالات پیدا ہوئے کہ مکہ پوری طرح مسخر ہو گیا۔

حدیث کی روشنی میں فلسطین کے مسئلہ پر سوچئے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس معاملہ میں امریکہ کو "تسریہ" کی حیثیت حاصل ہے۔ اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ اگر "فلسطین" میں عمل کر کے تمہارا مسئلہ

حل نہیں ہو رہا ہے تو اپنے عمل کا میدان "امریکہ" کو بنا لو۔ یعنی فلسطین کی جغرافیائی جدوجہد کو امریکہ کی دعوتی جدوجہد میں تبدیل کر دو۔ اسلام کے پر امن ربانی پیغام کو لے کر امریکہ میں داخل ہو جاؤ۔

حالات بتاتے ہیں کہ مسلمان اگر اس دعوتی کوشش کو صحیح انداز سے چلائیں تو انشا اللہ وہی ہوگا جو مدینہ میں ہوا۔ یعنی امریکہ کے بیشتر گھروں میں اسلام داخل ہو جائے گا۔ اور اگر امریکہ کی قابل لحاظ آبادی اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائے تو گوگیا مسلمانوں کو فلسطین کے مسئلہ کے حل کی کجی ہاتھ آگئی۔ عجب نہیں کہ اس کے بعد ایسا انقلابی نتیجہ سامنے آئے کہ کوئی کہنے والا کہہ پڑے — فلسطین کا وہ راستہ زیادہ قریب ہے جو امریکہ ہو کر جاتا ہے۔

### تاریخ کا اعادہ

بغداد، اسلام کی تاریخ میں بیک وقت دو چیزوں کی علامت ہے۔ اہل اسلام کی سیاسی بربادی، اور پھر سیاسی بربادی کے کھنڈر سے دوبارہ اسلام کی نئی دینی تاریخ کا ظہور میں آنا۔

۱۳ ویں صدی عیسوی میں بغداد مسلم تہذیب کا عظیم مرکز تھا۔ ۱۲۵۸ء میں نسل سوار ہلاکوں کا طاقتور قبائلی فوج کے ساتھ بغداد میں داخل ہوا۔ اس نے غلیظ المستقیم کو قتل کر دیا۔ اور وہاں کے ۸ لاکھ (800,000) باشندوں کو ہلاک کر ڈالا۔ مورخ ابن اثیر اس وقت زندہ تھا۔ اس نے عینی شہادت کے مطابق اپنی تاریخ میں ان واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ آدم کی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام حادثات میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا تو ایسا کہنا غلط نہ ہوگا۔

مگر اس حادثہ کے فوراً بعد یہ ہو کہ دوبارہ اسلام کے موافق اسباب تاریخ میں کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۵۰ سال بعد حالات بالکل بدل گئے۔ تلوار کی طاقت سے فوج حاصل کرنے والے تاتاری اسلام کی فکری اور روحانی طاقت سے مفتوح ہو گئے۔ اور پھر دنیائے دیکھا کہ جو لوگ اسلام کے شکن سمجھے جا رہے تھے، وہ اسلام کے خادم اور اس کے پاسبان بن گئے ہیں۔

۱۹۹۱ء میں دوبارہ بغداد کے ساتھ وہی معاملہ شدید تر شکل میں پیش آیا جو اس سے ۷۳۳ سال پہلے یہاں پیش آیا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک بے حد الناک حادثہ ہے۔ ایک معاصر مصنف نے موجودہ حادثہ کے پیچھے کام کرنے والی قوتوں اور ان کے خطرات کی تفصیل بتاتے ہوئے اس کو عالم عربی کے اوپر سب سے بڑا خطرہ (اکبر خطر علی العالم العربی) بتایا ہے۔

مگر راقم اطروف کو اس کے برعکس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شرے دوبارہ ایک خیر نظر ہوگا اور عجب نہیں کہ موجودہ خیر پہلے ذرے زیادہ بڑا ہو جس طرح موجودہ شر پہلے شر سے زیادہ بڑا تھا۔

اس خیر میں خیر کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ جدید مسلم قوموں میں پہلی بار یہ ذہن ابھر رہا ہے کہ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے سیاسی طریقہ مفید نہیں۔ اس مقصد کے لئے صحیح اور مفید طریق کار وہ ہے جس کو دعوتی طریق کار کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام کی فکری اور نظریاتی قوت کو عمل میں لا کر اسلام کا احیاء کرنا۔ اسلام کی پرامن طاقتوں کو بروئے کار لانا۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے۔ تبلیغ و دعوت ہی اس کی طاقت کا اصل راز ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جو تحریکیں اٹھیں انھوں نے مخصوص اسباب کے تحت سیاسی رخ اختیار کر لیا۔ ان تحریکوں کی دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو اسلامی سیاست اور اسلامی نفاذ کے نام پر اٹھیں اور دوسری وہ جنھوں نے سوشلزم اور عرب قومیت جیسے نعرے اختیار کر لئے۔ یہ دونوں قسم کی تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھیں مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کا حاصل ایک تھا۔ اسلامی تحریک اور اسلامی جدوجہد کا اصل انحصار عملیت و دعوت (dawah activism) پر ہوتا ہے۔ مگر ان تحریکوں نے مسلمانوں کو بے فائدہ طور پر عملیت سیاسی (political activism) حتیٰ کہ مزید تباہ کن طور پر عملیت عسکری (violent activism) میں مبتلا کر دیا۔

موجودہ زمانہ میں جو سائنسی انقلاب آیا ہے اس نے اسلام کی اشاعت کے لئے بے شمار نئے مواقع اور نئے امکانات کھول دئے تھے سب سے بڑا کرنے کا کام یہ تھا کہ ان دعوتی امکانات کو استعمال (avail) کیا جائے۔ مگر مذکورہ قسم کی سیاسی تحریکوں (خواہ وہ اسلام کے نعرہ پر اٹھی ہوں یا سیکولر نعرہ پر) دونوں کا مشترک نقصان یہ ہوا کہ جدید مسلم نسل کا ذہن سیاست کی طرف مڑ گیا اور اسلام کی دعوت اور اشاعت کے انتہائی قیمتی امکانات استعمال ہونے سے رہ گئے۔

میرے اندازے کے مطابق بغداد کا تازہ حادثہ زحمت کے بھیس میں رحمت (blessing in disguise) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حادثہ نے نہ صرف عرب قومیت کی تحریک کو بلکہ خود سیاسی عملیت کے ذہن کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ”بغداد“ کے کھنڈر سے ایک نیا ذہن ابھرے گا۔ تمام دنیا کے مسلمان پچھلے سوسالہ طریق کار پر نظر ثانی کریں گے اور



سیاسی عملیت (political activism) یا عسکری عملیت (violent activism) نقصان کو آخری حد تک محسوس کر کے اسے چھوڑ دیں گے اور عملیت دعوت (dawah activism) کو اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اختیار کر لیں گے۔

اب تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے تمام لکھنے اور بولنے والے استعماری اور صلیبی اور صیہونی سازشوں (المؤامرات والمخططات) کی اصطلاح میں سوچتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے تمام موجودہ مسائل خارجی دشمنوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یہ فکر یقینی طور پر ردِ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی نہ تھا۔ کیوں کہ قرآن و سنت میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمہارے مسائل ہمیشہ داخلی غفلت کے نتیجے میں پیدا ہوں گے نہ کہ خارجی سازشوں کے نتیجے میں۔

خیلیج کی جنگ نے اس دہم کا غبارہ توڑ دیا ہے۔ اب قوی امید ہے کہ انشاء اللہ مسلمان بے فائدہ مقابلہ آرائی کے طریقوں کو چھوڑ دیں گے۔ اور پوری طرح اس عمل کو اختیار کر لیں گے جس کو ہم نے دعوہ ایکٹورزم (dawah activism) کا نام دیا ہے۔

خیلیج کی جنگ مسلمانوں کے دورِ غفلت کا خاتمہ اور ان کے دورِ عمل کا آغاز ہے۔ اور کسی انسانی گروہ کے لئے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی غفلت اور بے شعوری کو ختم کر کے حقیقی عمل کے میدان میں اپنی مثبت جدوجہد شروع کر دے۔

تاریخ کے تمام بڑے واقعات بڑے بڑے حادثات کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ خیلیج کا معاملہ بھی مجھے اسی قسم کا ایک حادثہ نظر آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس برباد حال سے ایک نیا مستقبل ابھرے گا۔ ایسا ہونا اتنا یقینی ہے جتنا تاریک رات کے بعد روشن صبح کا آنا۔

## داخلی اصلاح، خارجی انقلاب

تفکر (thinking) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو خارج رخ (outward-oriented) تفکر اور دوسری کو داخل رخ (inward-oriented) تفکر کہا جاسکتا ہے۔ خارجی تفکر میں نظام (system) کو ساری اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے خارجی ڈھانچہ کی تبدیلی کو سب سے بڑا کام بتاتی ہے۔ اس کے برعکس داخلی تفکر میں ساری اہمیت انسانی فرد کو دی جاتی ہے۔ اس کی ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ فرد کے اندرونی وجود میں مکمل داخلی انقلاب پیدا کر دے۔

موجودہ زمانہ میں جن تحریکوں کو عمومی شہرت ملی، وہ سب کی سب وہی ہیں جو خارجی تفکر کی بنیاد پر اٹھائی گئیں۔ محققین اسلامی تحریک وہ ہے جو داخلی تفکر کی بنیاد پر اٹھے۔ جس کا نشانہ نہ وہ ہو کہ خارج میں پایا جانے والا اجتماعی ڈھانچہ۔ کیوں کہ خارجی ڈھانچہ اندرونی نظام کے تابع ہے، نہ کہ اندرونی نظام خارجی ڈھانچہ کے تابع۔ قرآن کے مطابق "نفس کی سطح پر تنقیر سے" قوم کی سطح پر تنقیر واقع ہوتی ہے (ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم) (العن ۱۱)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بیست سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ تعداد اور عمل اور قربانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی ظاہری مقدار تمام پیغمبروں کے مجموعی کام سے بھی زیادہ نظر آئے گی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے تمام کی تمام تحریکیں بالکل صفر ہو کر رہ گئیں۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں خارجی تفکر کی بنیاد پر اٹھیں، جب کہ خدا کے قانون کے مطابق، نتیجہ خیز اسلامی عمل صرف وہ ہے جو داخلی تفکر کی بنیاد پر انجام دیا جائے۔

### ایک مثال

فلج کے المیہ پر ایک ہندوستانی عالم کی کتاب ۱۹۹۱ میں چھپی ہے۔ اس کا نام ہے: اکبر خطر علی العالم العربی (عالم عرب کے اوپر سب سے بڑا خطرہ) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ البعث العربی کی تحریک جس کے زیر اثر بعث پارٹی وجود میں آئی، وہ عالم عرب کے لئے امریکہ اور برطانیہ کے تدبیر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ تحریک جزیرہ العرب کو دوبارہ جاہلیتِ ادلی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ کاروبار کے تمام بازرگان کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ عام مسلمان اس خطرناک

تحریک کے ارادوں اور منصوبوں سے واقف نہیں مگر وہ خود اس سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی واقفیت کی بنیاد پر انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ البعث العربی، یا صدام حسین کی بعث پارٹی عالم اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے تو یہ بلاشبہ قرآن کی تسبیح و تہلیل کے ہم معنی ہوگا۔ کیوں کہ قرآن کے نزول کی تکمیل کے بعد و انحراف پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ اہل کفر اور اہل باطل کی طرف سے تمہارے لئے خطرہ کا دور ختم ہو گیا۔ نزول قرآن اور تکمیل دین کے بعد اب کفر و باطل نامیدی کے دور میں داخل ہو گئے ہیں اور اسلام اور اہل اسلام امید کے دور میں اس لئے مسلمانو، تم دوسروں سے اندیشہ نہ کرو۔ اب تم کو صرف اللہ رب العالمین سے اندیشہ کرنا چاہئے:

الہوم یئس الذین اٰفروا من دینکم آج کفر کرنے والے تمہارے دین کی طرف سے یائس  
فلا تخشوہم واخشون (المائدہ ۳) ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، اور تم صرف مجھ سے  
ڈرو۔

التفسیر المنہجی میں اس آیت کی تشریح میں یہ الفاظ درج ہیں :

(فلا تخشوہم) ان بظہروا علیکم و "ان سے نہ ڈرو" کہ وہ تمہارے اوپر غالب آجائیں  
یصلوادیکم (واخشون) یعنی اخلصوا گئے اور تمہارے دین کو باطل کر دیں گے۔ اور "مجھ  
الخشیۃ لی... وقیل اظہرت دینکم علی سے ڈرو" یعنی ڈرو صرف میرے لئے خاص کر دو۔  
الادیان کلہا وامنتمکم من الاعداء اور کہا گیا ہے کہ میں نے تمہارے دین کو تمام دینوں  
پر غالب کر دیا ہے اور تم کو دشمنوں سے محفوظ کر دیا (۳/ ۲۴ - ۲۵)

ہے۔

تمام مفسرین نے اس آیت کی تشریح اسی انداز میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ مولانا عبد الماجد دریا بادی کے الفاظ میں یہ ہے :

"یہ گویا وعدہ الہی ہے کہ اب تشویش و تردید کی چیز غلبہ کفر اور استیلا کفار نہیں، بلکہ احکام شریعت سے تجاوز اور تنزل ہے، یہی چیز ایسی ہے جو مسلمانوں کو ضرر پہنچا سکتی ہے۔ اور ان کے ملی وجود کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے خشیت الہی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کمی مسلمانوں میں ضعف پیدا کر سکتی ہے



نکہ اہل کفر کی کوئی خارجی قوت، اور تازنخ و تجرہ نے اسے لفظ بلفظ صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔ اس چورہ سو سال کے عرصہ میں جب کبھی اور جہاں بھی ملت کو نقصان پہنچا ہے اپنے ہی ضعف ایمان سے، بے عملی سے، بد ملی سے خوف خدا کی کمی سے۔ (تفسیر ماجدی، جلد دوم، صفحہ ۱۸۳)

### دین ذریعہ حفاظت

خدا کا دین جب حقیقی طور پر لوگوں کی زندگیوں میں قائم ہو تو وہ اہل دین کے لئے ہر خطرہ کے مقابلہ میں حفاظت کی گارنٹی ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ حفاظت صرف اس وقت ہوتی تھی جب کہ ایک زندہ نبی قوم کے درمیان موجود ہو۔ کیوں کہ نبی کی رحلت کے بعد دین اپنی محفوظ حالت میں باقی نہیں رہتا تھا۔ اور جب دین محفوظ نہ ہو تو اس کے نتائج کیوں کر ظہور میں آسکتے ہیں۔

مگر پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے دین کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ اس لئے دین کے ذریعہ اہل دین کی حفاظت کا انتظام بھی اب قیامت تک کے لئے قائم ہو گیا ہے۔ اب مسلمانوں کے لئے خارجی دشمن سب سے بڑا خطرہ نہیں۔ اب ان کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ داخلی طور پر ان کے اندر دین کی حقیقت باقی نہ رہے۔ مسلمان اگر اللہ سے ڈرنے والے بن کر رہیں تو وہ اسی طرح اہل باطل کے فتنوں اور سازشوں سے محفوظ رہیں گے جس طرح نبیوں کے ماننے والے اپنے نبی کے دور حیات میں ان سے محفوظ رہتے تھے۔

قرآن کی روٹنی میں دیکھا جائے تو آج مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ خطرہ کی حالت یہ ہے کہ مسلمان آج اللہ سے ڈرنے والا نہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی نہیں جو بظاہر دیندار مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ اللہ کے خوف سے جو صفات پیدا ہوتی ہیں، وہ صفات موجودہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہیں۔ آج مسلمانوں کے اندر وہ صفات آگئی ہیں جو اللہ سے بے غوفی کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔ یہ حالت صرف عوام کی نہیں ہے، بلکہ خواص کی حالت بھی عموماً یہی ہے۔ موجودہ مسلمانوں میں ظاہری اسلام کی دھوم ضرور ہے، مگر خوف خدا والے اسلام کا ان کے اندر کوئی وجود نہیں۔ اللہ! اللہ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج مسلمانوں پر وہ وقت آگیا ہے جس کی آگاہی حدیث میں دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

عبید بن نفیر نے عوف بن مالک اشجعی کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ علم اٹھایا جائے گا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کہا جس کا نام زیاد بن ابید تھا، اے خدا کے رسول کیا ہم سے علم اٹھایا جائے گا، حالانکہ ہمارے درمیان خدا کی کتاب ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو اس کی تعلیم دے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو مدینہ کا سمجھدار آدمی جانتا تھا۔ یہ بود و نصاریٰ کیا تورات و انجیل کو نہیں پڑھتے۔ پھر بھی ان کی باتوں پر ان کا عمل نہیں ہے۔

جمہیرانِ نفیر کی ملاقات شداد بن اوس سے ہوئی۔ انھوں نے ان کو یہ حدیث سنائی۔ انھوں نے کہا کہ عوف نے سچ کہا۔ پھر شداد نے کہا۔ جانتے ہو، علم کا اٹھ جانا کیا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ شداد نے کہا، اس کے برتن کا چھلانا (ذہاب اوعیتہ) اس کے بعد شداد نے کہا:

هل تدري اى العلم يرفع، قال: کیا تم جانتے ہو کون سا علم اٹھایا جائے گا۔ قلت لا ادري۔ قال الخشوع حتى لا يسمي خاشعا انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا: خشوع اٹھایا جائے گا۔ یہاں تک کہ کوئی خاشع دکھائی نہ دے گا۔

ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، ۱/۱۵۳

اللہ کا خوف کوئی سادہ بات نہیں، اور نہ وہ زندگی سے غیر متعلق کوئی چیز ہے۔ اللہ کا خوف ایک کردار سا طاقت ہے۔ جن لوگوں کے سینہ میں اللہ کا خوف ہو، وہ عین اس کے نتیجہ میں سنجیدہ انسان بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر تواضع کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عہد کو پورا کرنے والے اور انصاف پر قائم ہونے والے بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی خواہش کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتے ہیں۔ اللہ کا خوف ان سے سرکشی اور بے راہ روی کا مزاج چھین لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق کی حمایت کرتے ہیں، خواہ وہ ان کے موافق ہو یا ان کے خلاف۔

یہ تمام اوصاف گویا خدائی ڈھال ہیں۔ یہ اوصاف جس گردہ کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں وہ اس کے لئے اس کے محافظین کے مقابلہ میں حفاظت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے اصل خطرہ کی بات یہ ہے کہ اس قسم کا دین ان میں موجود نہیں رہا۔ دین کے نام پر ان کے یہاں جو چیز ہے وہ کچھ نواہر دین ہیں نہ کہ حقیقت دین۔

## حفاظت کی صورتیں

اب اس قرآنی یسین و بانی کو موجودہ حالات پر چسپاں کیجئے اور دیکھئے کہ آج اگر مسلمانوں کے اندر خوف خدا والا اسلام زندہ ہوتا تو کس طرح انھیں غلبہ کیسے کسی المیہ سے بچانے کا ذریعہ بن جاتا۔

۱۔ صدام حسین اور ان کے ساتھیوں کے اندر اگر اللہ کا ڈر ہوتا تو وہ قرآن کے حکم (۱۴: ۳۴) کے مطابق، عہد کی پابندی کرتے۔ عراق کی حکومت اور کویت کی حکومت کے درمیان ۱۹۶۳ء میں باقاعدہ معاہدہ ہوا۔ اس کے تحت عراق نے یہ پابندی قبول کی کہ وہ کویت کو مستقل ملک کی حیثیت سے تسلیم کرے گا۔ اور اس کی ۱۹۳۲ء کی قائم کردہ سرحدوں کے احترام کا عہد کرے گا۔ اس کے باوجود عراق کے حکمرانوں نے اگست ۱۹۹۰ء میں اپنا ملک کویت کے اوپر حملہ کر دیا۔ عراق کے ”مجاہدین اسلام“ اگر اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو وہ کبھی

## اتفاقية ۱۹۶۳ حول الحدود بين الكويت والعراق

استجابة للجمعية التي يحسن بها الطرفان في ازالة كل ما يشوب العلاقات بين البلدين، اجتمع الوفد الكويتي الرسمي الذي يزور الجمهورية العراقية بدعوة من رئيس وزرائها بالوفد العراقي وذلك في بغداد في اليوم الرابع من اكتوبر (تشرين الاول) عام ۱۹۶۳.

وكان الوفد الكويتي يتألف من:

۱. سمو الشيخ صباح سعاد الصباح ولي العهد ورئيس مجلس الوزراء.
۲. سعادة الشيخ سعد العبد الله السالم الصباح وزير الداخلية ووزير الخارجية بالوكالة.
۳. سعادة السيد خليفة خالد الغنيم وزير التجارة.
۴. سعادة السفير عبد الرحمن سالم العتيقي وكيل وزارة الخارجية.

وكان الوفد العراقي يتألف من:

۱. اللواء السيد احمد حسن البكر رئيس الوزراء.
۲. الفريق الركن السيد صباح مهدي عماد وزير الدفاع ووزير الخارجية بالوكالة.
۳. الدكتور محمود محمد الحمصي وزير التجارة.
۴. السيد محمد كياره وكيل وزارة الخارجية.

وقد جرت المناقشات بين الوفدين في جو مفع بالود الاخي والتمسك برابطة العروبة والشعور باواصر الجوار وتحسن المصالح المشتركة.

وتاكيدا من الوفدين المجتمعين على رغبتهما الراسخة في توطيد العلاقات لما فيه خير البلدين بوحى من الاحداف العربية العليا، وايضا بالنسبة لاصلاح ما ران على العلاقات العراقية - الكويتية نتيجة موقف العهد القاسمي المائد تجاه الكويت قبل ثورة الرابع عشر من رمضان وبقيما بما يبله الواجب القومي من فتح صفحة جديدة من العلاقات بين الدولتين العربيتين تتفق وما بينهما من روابط وعلاقات بتحسرها على كل ظل لتلك الفجوة التي اصطنعها العهد السابق في العراق. وانطلاقا من ايمان الحكومتين بذاتية الامة العربية وحمية وحدها وبعد ان اطلع الجانب العراقي على بيان الكويت الذي في مجلس الامن الكويتي بتاريخ ۹ ابريل (نيسان) ۱۹۶۳ والذي تضمن رغبة الكويت في العمل على انتهاء الاتفاقية المفعودة مع بريطانيا في الوقت المناسب.

اتفق الوفدان على ما يلي:

اولا: تعترف الجمهورية العراقية باستقلال دولة الكويت وسيادتها التامة بحدودها الميضية بكتاب رئيس وزراء العراق بتاريخ ۲۱ يوليو (تموز) ۱۹۶۲ والذي وافق عليه حاكم الكويت بكتابه المؤرخ ۱۰ أغسطس (آب) ۱۹۶۲. ثانيا: تعمل الحكومتان على توطيد العلاقات الاخوية بين البلدين الشقيقين بحدودهما في ذلك الواجب القومي والمصالح المشتركة والاطلاع الي وحدة عربية شاملة. ثالثا: تعمل الحكومتان على اقامة تعاون ثقافية وتجاري واقتصادي بين البلدين وعلى تبادل المعلومات الفنية بينهما.

وتحقيقا لذلك يتم فوراً تبادل التمثيل الدبلوماسي بين البلدين على مستوى السفراء. واشهادا على ذلك وقع كل من رئيسي الوفدين على هذا المحضر.

رئيس الوفد العراقي  
اللواء احمد حسن البكر

رئيس الوفد الكويتي  
صباح السالم الصباح



ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ سے ڈرنے والا عہد کو پورا کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ عہد کو توڑنے والا۔

۲۔ عراق نے اس سے پہلے ستمبر ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ کیا۔ یہ واضح طور پر ایک مسلم ملک کی دوسرے مسلم ملک کے اوپر جارحیت تھی۔ یہ جارحیت آٹھ سال تک جاری رہی۔ مگر مسلم دنیا کے علماء میں سے کسی بھی قابل ذکر شخصیت نے اس جارحیت کی مذمت نہیں کی۔ تمام علماء اور اکابر خطبے علی العالم العربی جیسی کتابیں لکھنے والے تمام لوگ اس وقت آیات اللہ تعالیٰ کے خلاف بیان اور مضمون اور کتاب چھاپنے میں مشغول رہے جو بالواسطہ طور پر صدام حسین کی حمایت اور اس کی حوصلہ افزائی کے ہم معنی تھا۔

ہمارے علماء اگر فی الواقع اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو قرآن کے حکم عدل کے مطابق، وہ ایران کے خلاف عراقی حکمران کی جارحیت کی مذمت کرتے، جس طرح بعد کو انھوں نے کویت کے خلاف اُسس کی جارحیت کی مذمت کی۔ اگر تمام علماء اور تمام اکابر ملت ۱۹۸۰ میں صدام حسین کی پہلی جارحیت کی کھلی مذمت کرتے تو یمن ممکن تھا کہ صدام حسین کو دوبارہ کویت کے خلاف اس قسم کی جارحیت کا حوصلہ نہ ہو۔

۳۔ اگست ۱۹۹۰ میں عراقی حکمران صدام حسین نے ایک لاکھ سے زیادہ فوج کویت کے اندر داخل کر دی اور ایک پڑوسی ملک پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ مگر دنیا بھر کے پچاس سے زیادہ مسلم حکمران اس معاملہ میں کچھ بھی نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ متفقہ طور پر اس ظلم اور جارحیت کے خلاف آواز بلند کریں۔ اگر ان مسلم حکمرانوں میں اللہ کا خوف ہوتا تو یقینی طور پر وہ ظالم کے مقابلہ میں منسلکوں کی حمایت پر متحرک ہو جاتے۔ مثلاً پہلی فرصت میں تمام کے تمام حکمران کسی مقام پر جمع ہو کر مشورہ کرتے۔ وہ بغداد جا کر صدام حسین کے اوپر متفقہ انداز میں دباؤ ڈالتے اور اس طرح اس کو مجبور کرتے کہ وہ کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لے۔

بالفرض اگر اس قسم کا عملی اقدام ممکن نہیں تھا تو اتنا تو لازمی طور پر ہونا چاہئے تھا کہ تمام مسلم حکمران کمال اتفاق رائے کے ساتھ صدام حسین کے خلاف مذمت کی قرارداد پاس کر دیں۔ گونجی براۓ کے معاملہ میں وہ نہ عمل کی سطح پر کوئی متفقہ کارروائی کر سکے اور نہ قول کی سطح پر۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا کہ صدام حسین اس معاملہ میں تمام مسلم حکمرانوں کی حمایت کھودیتا تو ناگہن تھا کہ اس کے بعد وہ کویت کے خلاف اپنی جارحیت پر قائم رہ سکے۔

مسلم حکمرانوں نے کوئی ایک یا دوسری وجہ بنا کر مشترکہ میز پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اگر وہ

اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو رہہ کہتے کہ یہ ذرا موقع ہے جب کہ ہم آپس کے اختلافات کو مٹا کر اپنے منہاں ہوں۔  
بھائی کی مدد کریں اور کسی بھی وجہ کو متحدہ کارروائی میں رکاوٹ نہ بننے دیں۔

۴۔ یہی معاملہ مسلم عوام کا ہے۔ آج اگر مسلم عوام میں وہ دین زندہ ہوتا تو تقویٰ اور خشیت کے  
ادب پر قائم ہوتا ہے تو ساری دنیا کے مسلمان تروپ، اٹھتے۔ وہ کہتے کہ اسلام میں کسی مسلمان کی چیز دوسرے  
مسلمان کے لئے حرام ہے۔ پیغمبر اسلام نے تو اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کے  
سلئے ہتھیار کھولے۔ ایسی حالت میں یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایک مسلم ملک دوسرے مسلم ملک میں اپنی فوجیں  
داخل کر کے اس کے اوپر ناحق قبضہ کر لے۔

اگر موجودہ مسلمان اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو تمام مسلمان اس معاملہ میں صدام حسین کے مخالف  
ہو جاتے۔ وہ صدام حسین کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے۔ وہ خط اور تار اور ٹیلیفون کے ذریعہ صدام  
حسین پر زور ڈالتے کہ اس سے اس عمل بد سے باز رہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر خوف خدا ہو تا تو صدام حسین  
کو ساری دنیا میں ایک شخص بھی اپنی حمایت کرنے والا نہ ملتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر صدام حسین  
کے حوصلے پست ہو جاتے۔ وہ مجبور ہو جاتا کہ کویت کو خالی کر دے اور اپنی فوجوں کو وہاں سے واپس  
بلالے۔ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی حمایت بلاشبہ خدا ترسی کی علامت ہے۔

مگر مذکورہ کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقات  
میں سے کوئی ایک طبقہ بھی خشیت الہی کی سطح پر تلم نہیں۔ اور یہی کی وجہ کہ کوئی خارجی سازش، وہ اصل  
سبب ہے جس نے صدام حسین کا مسئلہ اور اس جیسے دوسرے خطرناک مسائل ہمارے لئے موجودہ زمانہ  
میں پیدا کر دیے ہیں۔

### پیرامن طاقت

خشیت الہی کا معاملہ محض روایتی عقیدہ کا معاملہ نہیں، اس کی حیثیت تمام انقلابی اصولوں سے  
زیادہ بڑے انقلابی اصول کی ہے۔ اللہ کی خشیت جب کسی انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ اس  
کی پوری شخصیت کو بدل دیتی ہے۔ وہ انسان کو بے راہ روی سے ہٹا کر راہ راست پر ڈال دیتی ہے۔  
وہ انسان کو مکمل طور پر اصلاح یافتہ انسان بنا دیتی ہے۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ خشیت کا اصول پیرامن تبدیلی کا اصول ہے۔ وہ امن کی طاقتوں

کو متحرک کر کے انسانیت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ امن کی طاقت، تشدد کی طاقت کے مقابلہ میں، بہت زیادہ بڑی اور بہت زیادہ اثر انگیز ہے۔

اوپر ہم نے دکھایا ہے کہ اگر موجودہ مسلمانوں میں خشیت الہی کی روح زندہ ہوتی تو خلیج کا مسئلہ کتنے اعلیٰ طریقے پر حل ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس تشدد کی طاقت کی بے اثری کو دیکھئے۔ امریکہ نے دوسری قویوں کو ساتھ لے کر خلیج کے مسئلہ کو تشدد کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس مسئلہ کے حل کے لئے تشدد کا استعمال اتنے بڑے پیمانہ پر کیا جو تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے نہ صرف عراق کو بلکہ کویت کو اور بالواسطہ طور پر خلیج کے پورے علاقہ کو ایسے تباہ کن مسائل میں مبتلا کر دیا جس سے نکلنے کے لئے پچاس برس کی مدت بھی شاید کافی نہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ حربی طاقت کے بے پناہ استعمال کے باوجود امریکہ کا اصل مقصد پورا نہیں ہوا۔ ٹائم میگزین (۳ جون ۱۹۹۱) نے صفحہ ۳۰-۳۱ پر اس معاملہ میں امریکہ کا ایک جائزہ چھاپا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خلیج کے آفت زدہ علاقہ کی نئی حقیقتوں نے امریکہ کے اس خواب کو ایو سی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں ایک نیا نظام قائم کرے:

U.S. dreams of helping build a new Middle East Order are frustrated by the realities of a troubled and troubling region (p. 30).

ٹائم میگزین نے امریکہ کے شہروں میں ایک اوپن ٹین پول کر لیا۔ اس کا ایک سوال یہ تھا کہ عراق کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے، عراق سے امریکہ کی جنگ کس حد تک کامیاب رہی:

Given the current events in Iraq, how successful was the war with Iraq?

اس سوال کے جواب میں سات فی صد امریکیوں نے کہا کہ (not at all) یعنی جنگ کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔ ۴۶ فی صد لوگوں نے کہا کہ (only partly) یعنی یہ جنگ صرف جزئی طور پر کامیاب ہوئی (صفحہ ۳۱)

اس جنگ میں امریکہ کا اصل نرٹ اندہ صدام حسین تھا۔ اور ساری تحریک کے باوجود، وہ بدستور اپنی کرسی پر باقی ہے۔ اپنی جنگی کارروائی کے آخر میں پہنچ کر امریکہ کو یہ مسئلہ پریشان کر رہا ہے کہ اگر وہ مزید



کارروائی کر کے صدام حسین کا خاتمہ کر دے تو موجودہ حالات میں اس کا الٹا نتیجہ نکلے گا۔ کیوں کہ صدام کے بعد عراق میں شیعہ قیادت ابھر آئے گی۔ اس کے بعد ایران کا اثر اس علاقہ میں بہت بڑھ جائے گا۔ ایران امریکہ کا سب سے بڑا دشمن ہے، اور ایران کا بڑھنا، امریکہ کے لئے، چھوٹے دشمن کو مار کر بڑے دشمن کو زندہ رکھنے کے معنی ہے۔

یہ تشدد کے طریقہ کی بے انزی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کا جو پر امن طریقہ ہے وہ کوئی نئی پیمیدگی پیدا کئے بغیر مسئلہ کو حل کرتا ہے، جب کہ دوسرے طریقوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مسئلہ کو حل کرنے کے نام پر مزید شدید تر مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔

داخلی کمی کا مسئلہ

مذکورہ قرآنی تشخیص کے مطابق، اس وقت کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ بیرونی خطروں اور سازشوں کا انکشاف کیا جائے۔ اس کے بجائے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ملت کے افراد میں خشیتِ الہی کی روح پیدا کی جائے۔ تعلیم و تربیت کے تمام ذرائع کو استعمال کر کے مسلمانوں کو نفسیاتی اعتبار سے اس مقام پر لایا جائے جہاں وہ، قرآن کے الفاظ میں، فلا تخشوہم و اخشون کا مصداق بن جائیں۔ وہ خشیتِ غیر خدا پر کھڑے ہونے کے بجائے خشیتِ خدا پر کھڑے ہوجائیں۔ اسی کے ذریعہ پہلے بھی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوا تھا اور اسی کے ذریعہ آج بھی ان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے (نہی صلحِ آخر

مذہب الامۃ الا بما صلح بہ اولہا، امام مالک)

حقیقت یہ ہے کہ خلیج کے المیہ نے عرب قومیت یا صلیبی اور صہیونی جیسے خارجی خطروں کو بے نقاب نہیں کیا ہے۔ بلکہ خود ملتِ مسلمہ کی اس داخلی کمی کو بے نقاب کیا ہے کہ وہ اپنے اصل مقام سے ہٹ گئی ہے۔ اس کو حقیقتہً خشیتِ الہی کے اوپر کھڑا ہونا چاہئے، مگر عملاً آج وہ اس سے دور ہے۔ یہ دوری یہاں تک پہنچی ہے کہ اس کے علماء تک اس سے واقف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اور دانشور اس کو خوفِ امتیاز کے غلطی آگاہی دے رہے ہیں۔ ایسا کوئی نہیں جو اس کو خدا سے بے خوفی کے خطرہ سے متنبہ کرنے کا کام انجام دے رہا ہو۔

موجودہ زمانہ میں عالمی سطح پر جو تحریکیں اٹھیں، مثلاً ڈیموکریسی، سوشلزم وغیرہ، ان سب کا زور خارجی سسٹم کو بدلنے پر تھا، فرد کے اندر انقلاب لانا، ان میں سے کسی کا نشانہ نہیں تھا۔ اسی سے

مسلمانوں کی وہ تمام تحریکیں بھی مست اتر ہو گئیں، جن کے محور کو آج کل "محوہ اسلامیہ" کہا جاتا ہے۔ "محوہ اسلامیہ" کے تحت مسلمانوں کی جو انقلابی تحریکیں ساری دنیا میں چل رہی ہیں، ان سب نے خارجی نظام کو اپنا نشانہ بنا رکھا ہے۔ داخلی انقلاب ان میں سے کسی کا نشانہ نہیں۔ یہی خاص کمزوری ہے جس کی بنا پر ہم آج یہ صورت حال دیکھ رہے ہیں کہ طوفان خیز اسلامی سرگرمیوں کے باوجود نتیجہ بالکل صفر ہے۔ کیوں کہ نتیجہ خشیت خدا پر لگتا ہے نہ کہ خشیت غیر خدا پر۔

پریس کا المیہ

ذہنی بگاڑ کی جس خرابی سے آج ہم دوچار ہیں، اس کو اتنا زیادہ عام کرنے میں سب سے زیادہ دخل پریس کا ہے۔ پریس کا دور اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت تھا، مگر مسلمانوں نے اپنی نادانی سے اس کو اپنے لئے ایک زحمت بنالیا۔

انیسویں صدی میں جب پریس کا دور آیا تو یہ زمانہ وہ نقاب کر مسلمان ساری دنیا میں خارجی قوموں کے متبادا میں مغلوبیت کا شکار ہو رہے تھے۔ اس وقتی سبب کے تحت مسلم پریس کا رخ "خارجی خطہ" کی طرف ہو گیا۔ نہ صرف اخبارات و رسائل بلکہ کتابیں بھی جو اس دور میں چھاپی گئیں وہ بھی اسی کے زیر اثر خارجی تفکیک کی نمائندگی کرنے والی تھیں۔ داخلی تفکیک جو حقیقی اسلامی تفکیک ہے، اس کی نمائندگی دور پریس میں کم از کم موثر انداز میں بالکل نہ ہو سکی۔

اس کے نتیجہ میں ایک بہت بڑی برائی ساری مسلم دنیا پر مسلط ہے۔ وہ یہ کہ خارجی تفکیک کے حق میں علمی نقصان پوری مسلم دنیا میں بخوبی طور پر پائی جاتی ہے، مگر داخلی تفکیک کے حق میں علمی نقصان مسلم دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ چنانچہ خارجی عمل کو لوگ بڑا اور اہم کام سمجھتے ہیں اور داخلی عمل کو چھوٹا اور غیر اہم کام۔

مثال کے طور پر آج جب ایک آدمی جہاد و قتال کی بات کرتا ہے تو مسلمان اس کی اہمیت کو فوراً سمجھ لیتے ہیں کیوں کہ پچھلے سو سال کے اندر مسلم پریس اور مسلم پلیٹ فارم سے جہاد و قتال کو سب اہم و عزیز ملک گھوری لگائی گیا ہے۔ اس کے برعکس اگر مسلمانوں کے سامنے صبر اور اعراض کی بات کہی جائے تو اس کی اصولی اہمیت ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ صبر و اعراض کی روش کو بزدلی قرار دے کر اسے نفرتانہ کر دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریس کی سو سال کی مدت میں کوئی بھی قابل ذکر مسلمان نہیں اٹھا جو اسلام

کی اس اہم تعلیم کو ملنی اور فکری سطح پر مدد مل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جہاد و قتال کے حق میں علمی فضا موجود ہے، مگر صبر و اعراض کے حق میں علمی فضا سرے سے موجود ہی نہیں۔

### عصری افکار کی مساعرت

اوپر جن دو قسم کی اسلامی تحریکوں کا ذکر کیا گیا، ان کو مزید کرنے کے لئے ان میں سے ایک کو انقلابی اسلامی تحریک اور دوسرے کو ربانی اسلامی تحریک کہا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ انقلابی اسلام کا نعروں لے کر اٹھتے ہیں، ان کو بہت جلد تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنے ہمنوا افراد مل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص ربانی اسلام کا پیغام لے کر اٹھے، وہ تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت کم افراد کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اس فرق کا سبب خود انقلابی اسلام کے علمبرداروں کی ذاتی لیاقت نہیں ہے۔ اس کا سبب دراصل زمانہ کی مساعرت ہے۔ ان کا پیغام اس ذہنی ڈھانچے کے مطابق ہے جو پچلے سے لوگوں کے اندر پایا جا رہا ہے۔ چنانچہ انقلابی اصطلاحوں میں بولنے والوں کی بات فوراً ان کی سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ڈیموکریسی اور سوشلزم وغیرہ کے نام سے جو تحریکیں اٹھیں، ان سب کا فکر مبنی بر نظام (SYSTEM BASED) فکر تھا۔ ان تحریکوں کی پشت پر دور جدید کی بڑی بڑی حکومتیں اور انتہائی بڑے بڑے ادارے تھے۔ انھوں نے اعلیٰ ترین ذرائع کو استعمال کر کے عالمی سطح پر لوگوں کے ذہنوں کی تشکیل کی۔ ساری دنیا کے تعلیم یافتہ لوگ اس انداز پر سوچنے لگے کہ انسانیت کی تعمیر کے لئے اصل کام اجتماعی ڈھانچہ نہیں تبدیل کرنا ہے۔ اس طرح نظامی طرز فکر وقت کا غالب طرز فکر بن گیا۔

اب ایک شخص جب اسلام کی دعوت کو سیاسی اور انقلابی اصطلاحوں میں بیان کرتا ہے تو ایسی دعوت لوگوں کے لئے ایک مانوس دعوت بن جاتی ہے۔ ذہنی رجحان کے اعتبار سے، وہ وقت کے شاکلہ کے عین مطابق ہوتی ہے۔ ایسی آواز فوراً لوگوں کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ بڑھ کر اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ربانی اسلام کی بات آج کے علمی ماحول میں بالکل اجنبی ہے۔ اس کے حق میں نہ علمی ذہن فضا موجود ہے اور نہ مسلم مفکرین نے اس کی پشت پر علمی دلائل کا زور جمع کیا ہے۔ اس بنا پر آج کے انسان کے لئے ربانی اسلام کا پیغام ایک اجنبی پیغام بن جاتا ہے۔ ان میں بہت کم افراد ایسے ملتے ہیں جو ربانی اسلام کی منویت کو سمجھیں اور ان کی گہرائی کے ساتھ اس کو قبول کر لیں۔



## علمی تائید کی ضرورت

اوپر کی تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں خارجی تفکیر کی مقبولیت کیوں ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں داخلی تفکیر کو ان میں مقبول عام کیوں حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر تبلیغی جماعت کو یہ لہجہ۔ وہ ایک ایسی جماعت ہے جس کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے داخلی تفکیر کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک کہا جاسکتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس کا کام زیادہ تر عوامی طبقے کے لوگوں میں محدود ہے۔ تقریباً سو سال کی محنت کے باوجود ابھی تک وہ خواص کے طبقہ میں نفوذ حاصل نہ کر سکا۔ طبقہ خواص کا کوئی آدمی اگر تبلیغ کے قریب آتا ہے تو وہ بھی برکت کے لئے آتا ہے نہ کہ حقیقتہً دینی جذبہ کی بنا پر۔


اس کا سبب یہ ہے کہ ”تبلیغ“ یا داخلی نوعیت کے کام کے حق میں علمی اور فکری فضا موجود نہیں۔ اور جس مشن کی پشت پر علمی افکار کا وزن شامل نہ ہو، وہ خواص کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔

ایک تعلیم یافتہ آدمی نے تبلیغی جماعت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ”تبلیغ والوں نے پہلے سیوا تئوں کو مسلمان بنایا، اب وہ تمام مسلمانوں کو میواتی بنا رہے ہیں۔ یہ تبصرہ صبح نہیں تاہم اس تبصرہ کا پس منظر بھی مذکورہ صورت حال ہے۔ وہ قائل کی اپنی ذہنی حالت کو بتا رہا ہے کہ تبلیغ کی واقعی حقیقت کو۔ ”تبلیغ“ یا بالفاظ دیگر، داخلی تفکیر والے کام کے حق میں آج علمی تصدیقات کا وزن شامل نہیں۔ خشیت اغیار کے موضوع پر بے شمار لٹریچر ہر زبان میں چھپا ہوا موجود ہے۔ مگر خشیت خدا کے موضوع پر کوئی طاقتور لٹریچر سرے سے دور پریس میں تیار ہی نہیں کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ ماحول میں خارجی تفکیر پر مبنی کاموں کو نوراً اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، جب کہ داخلی تفکیر پر مبنی کسی کام کو اٹھایا جائے تو لوگ اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ اپنے موجودہ ذہنی سانچہ کی بنا پر انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ تمام مسلمانوں کو ”میواتی“ بنایا جا رہا ہو۔

یہ ایک نہایت سنگین غلطی ہے جس کو پر کرنا انتہائی طور پر ضروری ہے۔ آج ضرورت ہے کہ داخلی تفکیر کے حق میں مضبوط علمی فضا تیار کی جائے۔ داخلی انداز کار کو ایک با وزن کام کی حیثیت سے دینا کے سامنے لایا جائے۔ پوسٹ کی طاقت، جس کو اب تک صرف خارجی تفکیر کے حق میں استعمال کیا گیا ہے، اس کو مزید شدت کے ساتھ داخلی تفکیر کے حق میں استعمال کیا جائے۔ جب تک یہ کام نہ ہوگا، قوم کا ذہن طبقہ (اشکچول کلاس) دین کی طرف مائل نہ ہوگا۔ جب کہ یہی ذہن طبقہ ہے جو سو سال کی کاہنما ہوتا ہے۔

ISLAMIC STUDIES

 **GOODWORD**

[www.goodwordbooks.com](http://www.goodwordbooks.com)

ISBN: 978-81-7898-646-3



9 7881 7898 6463